دُر مع الدهر کیف ما دار

جس طرح زمانہ پھرے اسی طرح تم پھر جاؤ

مقدمہ

جس میں شاعری کی ماہیت اور اسکے حسن و قبح پر مفصل بحث کی گئی ہے

مع

دیوان حالی

مشتمل بر قطعات و غزلیات و ترکیب بندات و رباعیات وغیرہ

مصنفہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی مقیم مدرسۃ العلوم علی گڈھ

سنہ ۱۸۹۳ء

مطبع انصاری واقع دہلی میں چھپکر

باہتمام شیخ

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپا

دُرو مع اللہ ہیں سبکے ما نغیف دار

جس رُخ زمانہ پھرے اوسی رُخ پھر جاؤ

مقدمہ

جسمیں شاعری کی ماہیت اور اوسکے حسن و قبح پر مفصل بحث کی گئی ہے

مع

دیوانِ حالی

مشتمل بر قطعات و غزلیات و ترکیب بندات و رباعیات وغیرہ

مصنفہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی مقیم مدرسۃ العلوم علی گڈھ

سنہ ۱۸۹۳ع

مطبع انصاری واقع دہلی میں چھپکر

ٹائیٹل پیج

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کانپور میں چھپا

فہرست مضامین مقدمہ

کے اُن کھنڈروں کی زبانِ حال سے جو مدائن میں اُسنے اپنی آنکھ سے دیکھے اُنکی تباہی و بربادی کو اسطرح بیان کرتا ہے۔

ما بارگہِ دادیم۔ ایں رفت ستم بر ما
برقصرِ ستمگاراں آیا چہ رسد خذلان؟

یعنی ہم جو کبھی نوشیرواں کے عدل و انصاف کی بارگاہ تھے جب گردش روزگار نے ہمیں اسحال کو پہنچادیا تو ظالموں کے محلوں پر کیا نوبت گذرتی ہوگی

فردوسی اُس گفتگو کو جو یزدجرد نے سعد وقاص کے ایلچی سے کی تھی اسطرح بیان کرتا ہے

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید ست کار

کہ ملکِ عجم را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

فردوسی نے اسموقع پر جیسا کہ اُسکے بیان سے ظاہر ہے بالکل یزدجرد کا جامہ پہن لیا ہے اور اُسکے غصہ اور جوش کی نقل کو بالکل اصل کر دکھایا ہے۔

جوش سے یہ مراد نہیں ہے کہ مضمون خواہ نخواہ نہایت زوردار اور جوشیلے لفظوں میں ادا کیا جائے ممکن ہے کہ الفاظ نرم ملائم اور دھیمے ہوں۔ مگر انمیں غایت درجہ کا جوش چھپا ہوا ہو۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں

شنیدہ ام سخنے خوش کہ پیر کنعاں گفت
فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

میر تقی کہتے ہیں۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستمزدہ کو ہمنے تھام تھام لیا

مگر ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قائم رکھ سکتے ہیں جو ٹھٹی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں اور اِس جوش کا پورا پورا اندازہ کرنا اُن لوگوں کا کام ہے جو صاحبِ ذوق ہیں اور جنپر بے محل ہزاروں آہیں اور نالے اتنا اثر نہیں کرتے جتنا کہ برمحل کسیکا ایک ٹھنڈا سانس بھرنا۔

عبرانی اور عربی شاعری میں سب سے زیادہ جوش تھا

عبرانیوں کی شاعری سب سے زیادہ جوشیلی مانی گئی ہے۔ ایک یوروپین محقق کا قول ہے کہ عبرانی شاعروں کے کلام میں اسقدر جوش ہے کہ اُنکا شعر سُن کر یہ معلوم ہوتا ہے گویا صحرا میں ایک تناور درخت جل رہا ہے یا ایک شخص پر وحی نازل ہو رہی ہے عرب کی شاعری بظاہر عبرانی شاعری پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اُسمیں بھی بے انتہا جوش پایا جاتا ہے۔ اسلیئے جیساکہ یوروپ کے مؤرخ لکھتے ہیں عرب یونانیوں کی شاعری سے نفرت کرتے تھے کیونکہ اُنکو یونانی شاعری اپنی شاعری کے آگے پھیکی۔ ٹھنڈی اور آورد سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یونانیوں کی جتنی کتابیں اُنھوں نے ترجمہ کیں اُنمیں ایک بھی دیوانِ شعر ترجمہ نہیں ہوا۔ وہ **ہومر۔ سفوکلیز** اور **پنڈار** کو اپنے شعرا کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں ہم نمونہ کے طور پر ایک مختصر عربی نظم کا ماحصل اردو میں لکھکر ناظرین کو دکھاتے ہیں تاکہ اُنکو معلوم ہو کہ عرب شعر میں کسقدر جوش ظاہر کرتے تھے۔ مگر چونکہ اردو میں عربی زبان کی خوبی باقی رہنی ناممکن ہے اسلیئے یہ ایک ناقص نمونہ عربی اشعار کا ہوگا۔

بَشَامہ بن حزن **نہشلی** جو ایک اسلامی شاعر ہے فخریہ اشعار میں کہتا ہے۔

"ہم نہشل کے پوتے نہشل کے پوتے ہونے پر فخر کرتے ہیں اور نہشل ہمارا دادا ہونے پر فخر کرتا ہے"

"عزت اور برتری کی کسی حد تک گھوڑے دوڑائے جائیں سب سے آگے بڑھنے والے جب پاؤ گے بنی نہشل ہی کے گھوڑے پاؤ گے"

"ہم میں سے کوئی سردار جب تک کہ کوئی لڑکا اپنا جانشین بننے کے لایق نہیں چھوڑتا دنیا سے نہیں اُٹھتا۔"

"لڑائی کے دن ہم اپنی جانیں سستی کر دیتے ہیں مگر امن کے زمانے میں اگر اُنکی قیمت پوچھیے تو انمول ہیں"

"ہماری مانگوں کے بال (عطریات کے استعمال سے) سفید ہیں ہماری دیگیں مہمانوں کے لیے گرم ہیں ہمارا مال ہمارے مقتولوں کے خونبہا کے لیے وقف ہے"

"میں اُس قوم میں سے ہوں جسکے بزرگوں نے دشمنوں کے لتنے کہنے پر کہ "کہاں ہیں قوم کے حمایتی" اپنے کو نیست و نابود کر دیا"

"اگر ہزار میں ہمارا ایک موجود ہو تو بھی جب یہ کہا جائے گا کہ "کون ہے شہسوار" تو اُسکی اپنے ہی پر نگاہ پڑے گی"

"ہمارے لوگوں پر کیسی ہی سخت مصیبت پڑے اُنکو اور کسی طرح اپنے مقتولوں پر روتا نہ پاؤ گے"

"ہم اکثر ہولناک موقعوں میں گھس جاتے ہیں مگر حمیت اور تلواریں جنھوں نے ہم سے قول ہارا ہے ہماری سب مشکلیں آسان کر دیتی ہیں"

عرب کی شاعری میں زیادہ جوش ہونے کا سبب کچھ تو اُنکے گرم خون کی جبلّی خاصیّت تھی اور زیادہ تر یہ بات تھی کہ اُنکی شاعری کا مدار محض واقعات اور دل کے سچے حالات اور واردات پر تھا۔ عشقیّہ اشعار زیادہ تر وہی لوگ کہتے تھے جو فی الواقع کسی کے ساتھ عاشقانہ دلبستگی رکھتے تھے۔ رزمیّہ اشعار وہی لوگ پڑھتے تھے جو فی الواقع حرب و کارزار کے مرد میدان تھے۔ فخریّہ اشعار میں وہ وہی واقعات بیان کرتے تھے جو اُنسے یا اُنکے بزرگوں سے یا اُنکے قبیلہ کے لوگوں سے علی الاعلان ظاہر ہوتے تھے اور جنکے سبب سے اُنکی بہادری یا فیاضی یا فصاحت ضرب المثل ہوجاتی تھی۔ اُن کی مرثیہ گوئی محض تقلیدی نہیں ہوتی تھی بلکہ جس شخص کے دل پر کسی دوست یا عزیز یا بزرگ یا نامور آدمی کی موت سے چوٹ لگتی تھی وہ اُسکا مرثیہ لکھتا تھا اور صحیح صحیح اپنے دل کی واردات کا نقشہ کھینچتا تھا۔ محبت۔ عداوت ہمدردی۔ صبر۔ استقلال۔ غصہ۔ انتقام۔ جوانی۔ بڑھاپا۔ دنیا کی بے ثباتی۔ خدا کی عظمت و جلالت ظالم کی مذمت۔ مظلوم کی فریادرسی۔ صلۂ رحم۔ یا قطع رحم۔ غرضکہ جس مضمون کا جوش اُن کے دلمیں اُٹھتا تھا اُسکو بغیر ساختگی اور تصنّع کے بیان کرتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ خلافت عباسیّہ کے زمانہ سے یہ سچّا جوش کم ہونا شروع ہوا اور آخرکار شعر کے تمام اصناف میں تقلید پھیل گئی شعر بجائے اسکے کہ خود شاعر کے جذبات کا آئینہ ہو وہ قدما کی طرز وروش بلکہ اُنھیں کے جذبات کا آئینہ اور اُنھیں کے خیالات کا ارگن بنگیا۔ قدما سچ مچ اپنے اور اپنے بڑوں کے کارہائے نمایاں پر فخر کرتے تھے۔ متاخرین جھوٹی خودستائیاں کرکے اُنکا مونہ چڑانے لگے اور اُسکا نام سنّت شعرا رکھا۔ قدما سچ مچ کسی نہ کسی اصلی معشوقہ کی محبت میں اپنے دل کے جذبات اور واردات

بیان کرتے تھے اور یہی سبب ہے کہ اُنکے ہاں صدہا اصلی نام اُنکی معاشیق کے موجود ہیں جیسے لیلے سلمی سُعاد۔ سُعدی۔ عذرا۔ عزہ۔ خولہ۔ بُثَینہ۔ عُنَیزہ۔ فاطم۔ زینب وغیرہ وغیرہ۔ مگر متاخرین نے شیرخوار بچوں کیطرح کہ روتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیوں روتے ہیں محض تقلیداً فرضی ناموں سے لَو لگا کر اپنی جدائی اور شوق و آرزو کا دُکھڑا رونا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ عرب سے یہ رنگ ایران میں اور وہاں سے ہندوستان میں پُہنچا اور آخرکار مُسلمانوں کی شاعری کا حال اُس ویران بستی کا سا ہوگیا جو کبھی آدمیوں سے معمور تھی مگر اب وہاں سُونے مکانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اب ہم چند مثالیں ایسے اشعار کی لکھتے ہیں جنمیں ملٹن کی تینوں شرطیں یا اُنمیں سے ایک یا دو شرط پائی جائے۔ یا بالکل کوئی شرط نہ پائی جائے۔

(۱) ابن یحیی بن زیادہ۔ مکروہات دنیوی کو خوشی سے قبول کرنے کے باب میں کہتے ہیں

وَلَمَّا رَأَیْتُ الشَّیْبَ لَاحَ بَیَاضُہٗ ۔۔۔ بِمَفْرِقِ رَأْسِی۔ قُلْتُ لِلشَّیْبِ مَرْحَبَا

وَلَوْ خِفْتُ اَنِّیْ اِنْ کَفَفْتُ تَحِیَّتِیْ ۔۔۔ تَنَکَّبَ عَنِّیْ۔ رُمْتُ اَنْ یَتَنَکَّبَا

وَلٰکِنْ اِذَا مَا حَلَّ کُرْہٌ۔ فَسَامَحَتْ ۔۔۔ بِہِ النَّفْسُ یَوْمًا۔ کَانَ لِلْکُرْہِ اَذْھَبَا

یعنی جب میں نے دیکھا کہ بُڑھاپا میرے سر کے بالوں میں نمودار ہوا۔ تو میں نے اُسکو خیر مقدم کہا۔ اگر یہ امید ہوتی کہ وہ ایسا نہ کرنیسے ٹل جائیگا۔ تو میں اُسکے ٹالنے میں کوشش کرتا مگر بات یہ ہے کہ مصیبت کے دفع کرنے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ اُسکو بکشادہ پیشانی قبول کیا جائے۔

(۲) مُتَمّم بن نُوَیرہ اپنے بھائی مالک کے مرثیہ میں لکھتے ہیں۔

لَقَدْ لَامَنِی عِندَ القبورِ عَلَی البُکا — رفیقی لِتَذْرافِ الدُّموعِ السوافکِ

فَقَالَ اَتَبکِی کُلَّ قَبرٍ رَأیتَہٗ — لِقَبرٍ ثَوٰی بَینَ اللِّوٰی والدکادکِ

فَقُلتُ لَہٗ اِنَّ الشَّجَا یبعثُ الشَّجَا — فدعنی فھذا کُلُّہٗ قَبرُ مَالکٍ

یعنی میں جو قبرستان کو دیکھکر رونے لگا تو میرے رفیق نے میرے آنسو جاری دیکھکر مجھکو ملامت کی کہ جو قبر (یہاں سے بہت دور) مقام لوٰی اور دکادک کے بیچ میں واقع ہے (یعنی قبر مالک) اُسکے لیئے تو ہر قبر کو دیکھکر رو پڑتا ہے میں نے کہا (اے عزیز) مصیبت مصیبت کو یاد دلاتی ہے بس مجھکو رونے دے میرے نزدیک یہ سب مالک ہی کی قبریں ہیں۔

(۳) **ناصر خسرو** دنیا کی حقیقت بیان کرتا ہے

ناصر خسرو براہے میگذشت — مست ولایعقل نہ چوں میخوارگاں

دید گورے چند و مبرز روبرو — بانگ بر زد گفت کاے نظارگاں

نعمتِ دنیا و نعمت خوارہ بیں — اینش نعمت اینش نعمت خوارگاں

(۴) **نظامی** مناجات میں کہتے ہیں۔

پردہ براندازو بروں آے۔ فرد — ورنہ منم آں پردہ بہم برنورد

(۵) **نظیری** بیت اللہ سے رخصت ہوتے وقت کہتا ہے۔

مطربِ مستم زخلوتگاہ سلطان آمدہ — سرخوش احسان شدہ باخود بہ الحان آمدہ

(۶) **خواجہ حافظ** اپنی ایک خاص جدائی حالت کو جس سے بے درد لوگ نامحرم ہیں اسطرح بیان کرتے ہیں۔

شبے تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل — کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

(۷) **شیخ ابراہیم ذوق** اس بات کو کہ مرنے کے بعد بھی اگر راحت نہ ملی تو دل کو تسلی دینے کی پھر کوئی صورت نہیں یوں بیان کرتے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

(۸) **مرزا غالب** انسان کے لاشئے اور ہیچ ہونے کو اسطرح ادا کرتے ہیں۔

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا — ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

(۹) **میر تقی** فرط محبت و دلبستگی کی اسطرح تصویر کھینچتے ہیں۔

جب نام تیرا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

۱۰ **خواجہ میر درد** اپنی شہرت اور مقبولیت کا محض بے اصل و بے بنیاد ہونا اسطرح ظاہر کرتے ہیں۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے — کسلیئے آئے تھے ہم کیا کر چلے

ان تمام مثالوں میں جیساکہ ظاہر ہے بیان کی سادگی اصلیت اور جوش تینوں باتیں بوجہ احسن پائی جاتی ہیں۔

(۱۱) **نظیری** اُس حالت کو جب کہ اُسنے سفر حج کا ارادہ کیا ہے اور تعلقات دنیوی سے آزاد ہونے اور خدا کی طرف رجوع کرنے کا شوق اُسکے دلمیں موجزن ہے اسطرح بیان کرتا ہے۔

سگ آستانم اما ہمہ شب قلادہ خایم — کہ بسر شکار دارم نہ ہوائے پاسبانی

عجب ار نبودہ باشد خضر سے بجستجویم — کہ فتادہ ام بہ ظلمت چو زلال زندگانی

پہلے شعر میں اپنے تئیں بلحاظ اسکے کہ تعلقات میں پھنسا ہوا ہے سگ آستان قرار دیا ہے جو رات بھر اپنے مالک کے مکان کی پاسبانی کرتا ہے مگر بلحاظ اسکے کہ تعلقات کو ترک کرکے رجوع الی اللہ کرنا چاہتا ہے اپنے کو شکاری کُتّے سے تشبیہ دی ہے جو رات بھر شکار کے شوق میں اپنے گلے کے پٹّے کو چباتا ہے کہ اُسکو کاٹ کر شکار کی تلاش میں جنگل کی راہ لے دوسرے شعر میں اُسنے یہ مضمون ادا کیا ہے کہ انسان جسمیں یہ قابلیت ہی کہ ترقی کرکے ملاء اعلےٰ تک پہنچ جائے اُسکا دنیوی تعلقات میں آلودہ رہنا ایسا ہے کہ گویا آب حیات ظلمات میں چھپا ہوا ہے اور چونکہ جاذبۂ لطف الٰہی ہر وقت انسان کی گھات میں ہے کہ اُسکو اپنی طرف کھینچکر تعلقات کے پھندے سے نجات دے اور نیز یہ بھی مشہور ہے کہ خضر سکندر کو ساتھ لیکر آب حیات کی تلاش میں گئے تھے اسلیے جاذبۂ الٰہی کو خضر سے اور آپ کو آب حیات سے تشبیہ دیکر کہتا ہے کہ تعجب ہے اگر خضر میری تلاش میں نہو کیونکہ میں آب حیات کی طرح ظلمات میں پڑا ہوا ہوں۔

ان دونو شعروں میں اصلیت اور نہایت درجہ کا جوش دونو باتیں کمال خوبی کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ایسے بلیغ اشعار کی نسبت یہ کہنا بے دردی ہے کہ انمیں کسی چیز کی کسر ہی اور کسی خوبی میں کمی ہے لیکن جو معنی سادگی کے اوپر بیان کیے گئے ہیں اُنکے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ اُنمیں سادگی ایسی نہیں پائی جاتی کہ عام اہل زبان یا زباں دان اُسکو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

(۱۲) **مومن** اس مضمون کو کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ایک ضروری بات ہے اور اسلیے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں۔ اسطرح

بیان کرتے ہیں۔

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

اس شعر میں اصلیت اور جوش دونو باتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر تیسری چیز یعنی سادگی جس سے الفاظ اور خیال دونو کی سادگی مراد ہے البتہ نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ جب تک یہ جملہ کہ "اہلِ دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے" شعر میں اضافہ نہ کیا جائے۔ عام ذہن معنی مقصود کیطرف انتقال نہیں کرسکتے۔ لیکن اسمیں شاعر نے ایک لطافت رکھی ہے جو سادگی کا نعم البدل ہوسکتی ہے اگر بیان زیادہ صاف ہوتا تو وہ لطافت باقی نہ رہتی۔ اُسنے یہ جملہ گویا قصداً حذف کردیا ہے اور یہ جتانا چاہتا ہے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اُسکے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں

(۱۳) آتش کہتے ہیں۔

فرصت اک دم عہدِ طفلی میں نہ رونے سے ملی پرورش پایا ہوا ہوں دامن سیلاب کا

جامۂ تن ہوگیا راہِ عدم میں نذرِ گور بوجھ اُٹھایا تھا مگر ٹھگ کے لیئے اسباب کا

ساحلِ مقصود دیکھا میں نے جاکر گور میں ڈوبنا کشتیِ تن کو مژدہ تھا پایاب کا

ان تینوں شعروں میں شاید مشکل سے کسی نہ کسی قسم کی اصلیت تو نکل آئے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے نہ بیان میں سادگی ہے نہ جوش۔

(۱۴) نظیری کہتا ہے۔

رہ نداد آنقدرم بر سرِ خوانِ تو فلک کز نمکدانِ تو بر لب زنم انگشت نمک

رستخیزے است کہ شود زیر و زبر وضع جہاں چند رختم لبما باشد و بختم بہ سمک

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ خوانِ معرفتِ الٰہی سے مجھکو اتنا بھی حصہ نہ ملا کہ نمکدانی سے نمک تو اُنگلی پر لگا کر چکھ لیتا۔

دوسرے شعر میں وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں باعتبار اپنی قابلیت اور استعداد کے جوہر علوی ہوں مگر میرا نصیب اپنی پستی کے سبب تحت الثرے میں پڑا ہوا ہے۔ پس کہتا ہے کہ کاش ایسی رستخیز یعنی انقلاب برپا ہو جس سے جہان زیر و زبر ہو جائے اور میرا نصیب پستی سے بلندی پر پہنچ جائے۔ ان دونو شعروں میں اصلیت اور جوش بخوبی پایا جاتا ہے۔ لیکن طرز بیان کسیقدر عام اذہان سے بالاتر ہے۔

(۱۵) آتش کہتے ہیں۔

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں ۔۔۔ چلا جب جانور انساں کی چال اُسکا چلن بگڑا

نہیں بے وجہ ہنسنا اسقدر زخمِ شہیداں کا ۔۔۔ تری تلوار کا مونہ کچھ نہ کچھ اسے تیغ زن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک ۔۔۔ نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

یہ تینوں شعر صاف ہیں مگر انمیں سادگی بیان کے سوا جیسا کہ ظاہر ہے نہ اصلیت ہے نہ جوش۔

(۱۶) ذوق کہتے ہیں۔

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے ۔۔۔ جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں ۔۔۔ شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

اِن شعروں میں بھی سادگی بیان کے سوا نہ اصلیت ہی نہ جوش۔

اب صرف دو احتمال باقی رہ گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کلام میں صرف جوش پایا جائے اور

سادگی و اصلیت نہ پائی جائے۔ دوسرے یہ کہ سادگی اور جوش پایا جائے اصلیت نہ پائی جائے۔ لیکن جوش کے لیے اصلیت کا ہونا ایسا ضروری ہے کہ بغیر اسکے ہرگز کلام میں جوش متحقق نہیں ہوسکتا پس یہ دونوں صورتیں ممکن الوقوع نہیں۔

رہا وہ کلام جسمیں نہ سادگی نہ جوش نہ اصلیت تینوں چیزیں نہ پائی جائیں۔ سو ایسے کلام سے ہمارے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں کیونکہ ہماری شاعری زیادہ تر اب دو قسم کے مضامین میں منحصر ہے۔ عشقیہ یا مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل مثنوی اور قصائد کی تشبیب میں باندھے جاتے ہیں۔ اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔ سو ان تینوں صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آتے ہیں اور جو بندھتے بندھتے بمنزلہ اصول مسلمہ کے ہوگئے ہیں اُنھیں کو ہمیشہ بہ ادنیٰ تغیر باندھتا رہے اور اُنسے سرِمو تجاوز نہ کرے مثلاً غزل میں ہمیشہ معشوق کو بے وفا۔ بے مروت۔ بے مہر۔ بے رحم۔ ظالم۔ قاتل۔ صیاد۔ جلاد۔ ہرجائی۔ اپنے سے نفرت کرنے والا۔ اوروں سے ملنے والا۔ سچی محبت پر یقین نہ لانے والا اہلِ ہوس کو عاشق صادق جاننے والا۔ بدگمان۔ بدخو۔ بدزبان۔ بدچلن۔ غرضکہ ایک حُسن و جمال یا ناز و ادا یا دیگر حرکات مہر انگیز کے سوا اور تمام ایسی برائیوں کے ساتھ اسکو موصوف کرنا جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرسکتا ہے۔ اور اپنے تئیں غمزدہ مصیبت زدہ فلک زدہ ضعیف۔ بیمار۔ بدبخت۔ آوارہ۔ بدنام۔ مردودِ خلائق۔ آوارگی پسند۔ بدنامی کا خواہاں حُسنِ قبول سے نفور۔ خوشی اور عافیت سے کنارہ کرنے والا۔ بیخود۔ سرمست۔ مدہوش۔ خود فراموش وفادار۔ جفاکش۔ کہیں آزاد طبع اور کہیں گرفتاری کا آرزومند۔ کہیں صابر اور کہیں بیقرار

کہیں دیوانہ اور کہیں ہوشیار۔ کہیں غیور اور کہیں چکنا گھڑا۔ رشک کا پتلا۔ رقیبوں کا دشمن سارے جہان سے بدگمان۔ آسمان کا شاکی۔ زمین سے نالاں۔ زمانہ کے ہاتھ سے تنگ۔ غرضکہ ایک عشق اور وفاداری کے سوا اپنے تئیں اُن تمام صفات سے متصف کرنا جو عموماً انسان کے لئے قابل افسوس خیال کیجاتی ہیں۔ یا مثلاً آسمان اور زمانہ یا نصیب اور ستارہ کی شکایت کرنا یا زاہد و واعظ و صوفی کو لتاڑنا۔ اور بادہ کش و بادہ فروش اور ساقی و خمّار کی تعریف کرنی اور ان سے حُسنِ عقیدت ظاہر کرنا۔ ایمان و اسلام و زہد و طاعت سے نفرت اور کفر و بے دینی و گناہ و معصیت سے رغبت ظاہر کرنی۔ کبھی کبھی مال و جاہ و منصب دنیوی کو حقیر ٹھیرانا۔ اور فقر و عشق و آزادگی وغیرہ کو علم و عقل و سلطنت وغیرہ پر ترجیح دینی۔ اسیطرح کے اور چند مضامین ہیں جو غزل کے لئے بمنزلہ ارکان و عناصر کے ہوگئے ہیں۔ غزل کے ساتھ جو الفاظ مخصوص ہیں وہ بھی ایک نہایت تنگ دائرہ میں محدود ہیں۔ مثلاً معشوق کی صورت کو حور۔ پری۔ چاند۔ سورج۔ گل۔ لالہ۔ باغ اور جنت وغیرہ سے۔ اُسکی آنکھ کو نرگس۔ آہو۔ بادام۔ ساحر۔ مست۔ بیمار وغیرہ سے۔ زلف کو سنبل۔ مشک۔ عنبر۔ کافر۔ جادوگر۔ رات۔ ظلمات۔ دام۔ زنجیر۔ کمند وغیرہ سے۔ نگاہ و مژہ و غمزہ و ادا کو تیر و سناں و شمشیر وغیرہ سے۔ ابرو کو کمان سے۔ ذقن کو کوئیں سے۔ دانتوں کو موتیوں سے۔ ہونٹوں کو لعل۔ یاقوت۔ گلبرگ۔ نبات۔ آبحیات وغیرہ سے۔ مونہ کو غنچہ سے۔ کمر کو بال سے یا دونو کو عدم سے۔ قد کو سرو۔ صنوبر۔ شمشاد۔ قیامت وغیرہ سے۔ رفتار کو فتنہ۔ قیامت بلا۔ آفت۔ آشوب وغیرہ سے۔ اور اسیطرح اور بعض اعضا کو چند خاص خاص چیزوں سے تشبیہ دینا۔ معشوق کے سامان آرائش میں سے مشاطہ۔ شانہ۔ آئینہ۔ حنا۔ سرمہ۔ کاجل۔ غازہ۔ مسی

پان۔ کبھی قبا۔ بند قبا۔ کلاہ۔ چیرہ۔ دستار۔ اور کبھی برقع۔ نقاب۔ محرم۔ چادر۔ چوٹی۔ چوڑیاں اور خاص خاص زیوروں کا ذکر کرنا اور اُن کو خاص خاص چیزوں سے تشبیہ دینا۔

باغ میں سے چند چیزوں کو انتخاب کرلینا جیسے سرو۔ قمری۔ گل۔ بلبل۔ صیّاد۔ گلچین۔ باغبان۔ آشیانہ۔ قفس۔ دام۔ دانہ۔ یاسمن۔ نسرین۔ نسترن۔ ارغوان۔ سوسن۔ خار۔ گلبن وغیرہ۔

صحرا میں سے وادی۔ چشمہ۔ آب رواں۔ سبزہ۔ تشنہ۔ سیراب۔ سراب۔ صرصر۔ گرد باد۔ سموم۔ نخل۔ چنار۔ خار مغیلاں۔ رہزن۔ رہنما۔ خضر۔ قافلہ۔ جرس۔ آوازِ درا۔ محمل۔ لیلےٰ مجنوں۔ وحشت۔ جنوں وغیرہ

دریا میں سے کشتی۔ ناخدا۔ موج۔ گرداب ساحل۔ حباب۔ قطرہ۔ ماہی۔ نہنگ۔ غوطہ۔ شناوری وغیرہ۔

محفل میں سے شمع۔ پروانہ۔ شراب۔ کباب۔ پیالہ۔ مینا۔ صراحی۔ خُم۔ جرعہ۔ نشّہ۔ خمار۔ صبوحی۔ ساقی۔ دَور۔ نغمہ۔ مطرب۔ چنگ۔ ارغنون۔ مضراب۔ پردہ۔ ساز۔ رقص۔ وجد۔ سماع وغیرہ۔

سامانِ غم میں سے نالہ۔ آہ۔ افغاں۔ قلق۔ اضطراب۔ درد۔ رشک۔ ضبط۔ شوق۔ جدائی۔ یاد۔ تمنا۔ حسرت۔ حرماں۔ رنج۔ غم۔ الم۔ سوز۔ داغ۔ زخم۔ خلش۔ تپش۔ کاہش وغیرہ۔ یہ اور اسی قسم کے چند اَور الفاظ ہیں جن پر بالفعل اُردو زبان کی غزل گوئی کا دارومدار ہے۔

قصیدہ میں بھی صرف چند معمولی سرِ کل ہیں جنھیں ہمیشہ ہمارے شعرا

شبدیز فکر کو کاوے دیتے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے زیادہ شاعری کے جوہر دکھانے چاہے تو وہ مدح سے پہلے ایک تمہید لکھتا ہے جسمیں یا تو فصل بہار کا ذکر ہوتا ہے اگرچہ اُسوقت خزاں ہی کا موسم ہو۔ مگر اُس ذکر میں اس ناپاک دنیا کی فصل بہار سے کچھ بحث نہیں ہوتی بلکہ ایک اور عالم سے بحث ہوتی ہے جو عالمِ امکان سے بالاتر ہے یا زمانہ۔ آسمان۔ نصیب اور قسمت کی شکایت ہوتی ہی جسکو درحقیقت خدا کی شکایت سمجھنا چاہیئے جو زمانہ وغیرہ کی آڑمیں خوب دل کھولکر کیجاتی ہی اسمیں بھی شاعر اپنے واقعی مصائب بیان نہیں کرتا اور نہ ممدوح کو اپنے اوپر رحم دلانے کی باتیں کہتا ہے بلکہ جس قسم کے مصائب اگلے زمانہ کے شعرانے اپنی نسبت بیان کیئے تھے اور جیسے بہتان اُنھوں نے آسمان و زمانہ وغیرہ پر باندھے تھے یہ بھی بہ ادنے تغیر ویسی ہی مصائب بیان کرتا ہے اور اُسی قسم کے بہتان باندھتا ہے یا ایک فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف۔ اُسکے جور و ظلم کی شکایت۔ اور اپنے شوق و انتظار کا مسلسل یا غیر مسلسل بیان اسطرح کیا جاتا ہے جیساکہ عشقیہ مثنویوں یا غزلوں میں ہوتا ہے یا فخر و خودستائی میں تمام تمہید ختم کردیجاتی ہے۔

اسکے بعد مدح شروع ہوتی ہے۔ مدح میں اکثر ایک نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کیجاتی ہی کہ اگر بالفرض مداح اِس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی؟ عدالت میں ماخوذ ہو جائے تو قصیدہ میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اُسکا جرم ثابت ہو سکے۔ مدح میں زیادہ تر وہی معمولی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعرا باندھتے چلے آتے ہیں اور ہر ایک خوبی کے بیان میں

لباس کو زیادہ خوشنما بنانے کے لیے اُسکی ایسی قطع رکھی جائے۔ جس سے لباس کی علت غائی یعنی آسایش اور پردہ دونو فوت ہو جائیں۔ الغرض وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دار و مدار ہے اور جنکے سوا اُسمیں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جسکے سبب سے شعر پر شعر کا اطلاق کیا جا سکے یہ دونو شعر کی ماہیت سے خارج ہیں۔ اسی لیے زمانۂ حال کے محقق شعر کا مقابل جیساکہ عموماً خیال کیا جاتا ہے نثر کو نہیں ٹھیراتے بلکہ علم و حکمت کو ٹھیراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جسطرح حکمت کا کام براہِ راست یہی کہ ہدایت کرے تحقیقات میں مدد پہنچائے اور حقائق کو روشن کرے عام اس سے کہ کوئی اُس سے محظوظ یا متعجب یا متاثر ہو یا نہو۔ اسیطرح شعر کا کام براہِ راست یہی کہ فی الفور لذت یا تعجب یا اثر پیدا کر دے عام اس سے کہ حکمت کا کوئی مقصد اُس سے حاصل ہو یا نہو اور عام اس سے کہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ ✣

شعر کی تعریف

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر کوئی تعریف ایسی نہیں جو اُسکے تمام افراد کو جامع ہو اور مانع ہو دخول غیر سے۔ البتہ لارڈ مکالی نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے گو اُسکو شعر کی تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جو کچھ شعر سے آجکل مراد لیجاتی ہے اُسکے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " شاعری جیساکہ دو ہزار برس پہلے کہا گیا تھا۔ ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مگر مصور، بُت تراش اور ناٹک کرنے والے کی نقل شاعر کی نسبت کسیقدر کامل تر ہوتی ہے۔ شاعری کُل کس چیز سے بنی ہوئی ہے؟ الفاظ کے مجموعوں سے۔ اور الفاظ ایسی چیز ہیں کہ اگر ہومر اور ڈینٹی جیسے صناع بھی اُنکو استعمال

جیسا موقلم اور چھینی کے کام دیکھکر ہمارے خیال میں اُترتا ہے۔ لیکن شاعری کا میدان اسقدر ہی کہ بت تراشی۔ مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اُسکی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔ بت تراش فقط صورت کی نقل اُتار سکتا ہے۔ مصور صورت کے ساتھ رنگ کو بھی جھلکا دیتا ہے اور ناٹک کرنے والا بشرطیکہ شاعر نے اُسکے لیئے الفاظ مہیا کر دیئے ہوں صورت اور رنگ کے ساتھ حرکت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ مگر شاعری باوجودیکہ اشیاے خارجی کی نقل میں تینوں فنون کا کام دے سکتی ہے اُسکو تینوں سے اس بات میں فوقیت ہی کہ انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔ نہ وہاں مصوری کی رسائی ہے نہ بت تراشی کی اور نہ ناٹک کی۔ مصوری اور ناٹک وغیرہ انسان کے خصائل یا جذبات اسقدر ظاہر کر سکتے ہیں جسقدر کہ چہرہ یا رنگ اور حرکت سے ظاہر ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہمیشہ ادھورے اور نظر فریب نمونے اُن کیفیات کے ہوتے ہیں جو فی الواقع انسان کے بطون میں موجود ہیں۔ مگر نفس انسانی کی باریک گہری اور بوقلموں کیفیات صرف الفاظ ہی کے ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیا خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات۔ دولت کے انقلابات۔ سیرت انسان معاشرت نوع انسانی۔ تمام چیزیں جو فی الحقیقہ موجود ہیں۔ اور تمام وہ چیزیں جنکا تصور مختلف اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے سب شاعری کی سلطنت میں محدود ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہی جسکی قلمرو اُسیقدر وسیع ہے۔ جسقدر خیال کی قلمرو"

ایک اور محقق نے شعر کی تعریف اسطرح کی ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالا

[illegible]

ایسا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔ ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں اُنسے اصلا تعرض نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے اُنکے ایسی محال باتیں بیان کیجاتی ہیں جو کسی نفس پر صادق نہ آسکیں۔ ممدوح کی طرف اکثر وہ خوبیاں منسوب کیجاتی ہیں جنکی اضداد اُسکی ذات میں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جاہل کو علم و فضل کے ساتھ ایک ظالم کو عدل و انصاف کے ساتھ۔ ایک احمق اور غافل کو دانشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ ایک عاجز بے دست و پا کو قدرت و مکنت کے ساتھ۔ ایک ایسے شخص کو جسکی ران نے کبھی گھوڑے کی پیٹھ کو مس نہیں کیا شہسواری اور فروسیت کے ساتھ۔ غرضکہ کوئی بات ایسی نہیں بیان کیجاتی جسپر ممدوح فخر کرسکے یا جس سے لوگوں کے دلمیں اُسکی عظمت اور محبت پیدا ہو اور اُسکے محاسن تا آخر زمانہ میں یادگار رہیں۔

ہماری مثنویوں کا یہ حال ہے کہ اُنمیں معمولی حمد و نعت وغیرہ کے بعد اکثر پہلے کسی بادشاہزادہ یا وزیرزادہ یا امیرزادہ یا سوداگر بچہ کے حسن و جمال وغیرہ کی تعریف ہوتی ہے پھر اُسکو کسی پری یا شاہزادی یا وزیرزادی یا اور کسی کے ساتھ لگا مارا جاتا ہے۔ وہ اول اُسکے فراق میں شہر شہر اور جنگل جنگل مارا مارا پھرتا ہے۔ پھر آخرکار وصل سے کامیاب ہوتا ہے۔ یہ کامیابی ایسی ضروری ہے کہ اُسکی نسبت پہلے ہی سے پیشین گوئی کیجا سکتی ہے۔

جو لوگ فی الواقع مسلم الثبوت شاعر ہیں یا اپنے تئیں ایسا سمجھتے ہیں وہ تو جب مثنوی لکھینگے ضرور اسی قسم کی لکھینگے البتہ جو لوگ اُسدرجہ کے شاعر نہیں ہیں اُنکی مثنویاں تاریخی۔ مذہبی یا اخلاقی مضامین پر بھی دیکھی گئی ہیں لیکن اول تو یہ مضامین خود روکھے پھیکے ہوتے ہیں اور پھر اُن کے

لکھنے والے نہ تو بیان میں کچھ گرمی پیدا کرنی چاہتے ہیں اور نہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لہذا ان مثنویوں کو کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا پس ہمارے ہاں وہی مثنویاں رونق پاتی ہیں جن کی بنیاد عشق پر رکھی گئی ہو۔

اگرچہ قصہ کی بنیاد عشق یا بہادری پر رکھنے کا دستور قدیم سے چلا آتا ہے اور آج کل کے شائستہ قصے بھی جب تک اُنمیں عشق یا بہادری کا رنگ نہیں بھرا جاتا زیادہ مقبول نہیں ہوتے لیکن ہماری مثنویوں میں اور اُنمیں بہت بڑا فرق ہے۔ ہمارے ہاں جس قسم کے واقعات اول دو چار اُستاد باندھ گئے ہیں اُنھیں واقعات کو بادنے تغیر برابر باندھتے چلے جاتے ہیں۔ بیان کے اسلوب اور تشبیہات اور معشوق کے سراپا اور قصہ کے آغاز و انجام وغیرہ میں زیادہ تر اُنھیں کی تقلید کیجاتی ہے نتیجہ ہمیشہ شُدآمد قدیم کے موافق جدائی کے بعد وصال اور مصیبت کے بعد راحت کا مترتب کیا جاتا ہے۔ طالب و مطلوب کے دل پر جو حالات و واردات ایک دوسرے کی محبت میں فی الواقع گذرتے ہیں یا گذر سکتے ہیں اُنسے بہت کم تعرض کیا جاتا ہے۔ عشقیہ مضامین سے اخلاقی نتائج نکالنے کا کبھی بھولکر بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ بیان میں اثر مطلق نہیں ہوتا کیونکہ شاعر اس خیال سے کہ قدیم مثنویوں سے اپنی مثنوی میں کچھ جدت پیدا کرے ہمہ تن صنائع لفظی کے سرانجام کرنے میں منہمک ہوتا ہے اسلیئے اُسکو کلام میں اثر پیدا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

بخلاف شائستہ ملکوں کے کہ وہاں اکثر ہر قصہ یا مثنوی میں ایک اچھوتی اور نرالی بات پیدا کیجاتی ہے۔ عقل و عادت کے خلاف باتیں جنپر اکثر ہماری مثنویوں کا

قصوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے اُنمیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اُنکے قصے برائے نام فرضی سمجھے جاتے ہیں ورنہ اُنمیں تمام وقعات اور تمام واردات ایسے بیان ہوتے ہیں جو رات دن لوگوں پر گذرتے ہیں اور پھر اُنسے وہ ایسے اخلاقی۔ سوشل یا پولیٹکل نتایج نکالتے ہیں جنسے قوم کے خلاق معاشرت یا تمدن پر نہایت عمدہ اثر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی شتنویوں کی طرح اُنکے مطالعہ سے صرف عوام الناس اور بازاری لوگ ہی محظوظ نہیں ہوتے بلکہ فضلا و حکما کی سوسائٹی میں بھی انکی قدر کیجاتی ہے۔ اُنکے قصوں کا خاتمہ ہمیشہ کامیابی اور خوشی ہی پر نہیں ہوتا۔ بلکہ عادت الٰہی کے موافق کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی پر۔ کبھی خوشی اور کبھی اندوہ و غم پر ہوتا ہے۔

الغرض جب کہ ہماری موجودہ شاعری کا مدار من کل الوجوہ یعنی نہ صرف الفاظ و عبارات میں بلکہ خیالات و مضامین میں بھی محض قوم کی تقلید پر ہے اور جب کہ ہمارے ہاں یہ بات بالاتفاق تسلیم کی گئی ہے کہ "اَحسَنُ الشِّعرِ اَکذَبُہٗ" تو ہمکو اپنی شاعری کی موجودہ حالت میں **اصلیت** اور **جوش** دونو سے دست بردار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اصلیت اور کذب میں منافات ہے اور جوش بغیر اصلیت کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ رہی **سادگی** سو وہ موجودہ حالت میں اکثر مجبوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ کیونکہ جو معمولی خیالات اور مضامین زیادہ تر ہمارے شعرا کے زیر مشق رہتے ہیں الخوفُ رَما سادگی اور صفائی کے ہر اسلوب اور ہر پیرایہ میں ادا کئے جاچکے ہیں اب تاوقتیکہ طرز بیان میں کسیقدر پیچیدگی یا خیال میں کوئی بھونڈا اضافہ یا تبدیلی پیدا نہ کیجائے۔ اُسوقت تک آسانی سے کسی معمولی مضمون میں جدت نہیں دکھائی جاسکتی۔

اگرچہ ہمارے بعض شعرا ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے سادگی بیان کو سب چیزوں سے

مقام سمجھا ہے۔ جیسے میر و درد۔ اثر اور مصحفی وغیرہ لیکن چونکہ اُنھوں نے قدما کے خیالات و مضامین سے بہت کم تجاوز کیا ہے اسلئے اُنکے دیوان زیادہ تر بھرتی اور پُرگُن اشعار سے بھرے ہوئے ہیں میر کی نسبت مولانا **آزردہ** دہلوی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" ان لوگوں کو جو اعلےٰ درجہ کا اُستاد مانا گیا ہے اسکا سبب یہی ہے کہ انکے کلام میں وہی معمولی خیالات جو متقدمین سے برابر بندھتے چلے آتے تھے باوجود غایت درجہ کی سادگی او صفائی کے اکثر جگہہ ایسے نرالے اسلوبوں میں بیان ہوئے ہیں جو فی الواقع بےمثل وعدیم النظیر ہیں میر کے دیوان میں ایک غزل ہے **خاک میں۔ چاک میں۔ ہلاک میں** مولانا آزردہ کے مکان پر اُنکے چند احباب جنمیں **مومن** اور **شیفتہ** بھی تھے ایک روز جمع تھے میر کی اسی غزل کا یہ شعر پڑھا گیا۔

ابکے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سبکو یہ خیال ہوا کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقہ اور فکر کے موافق باندھکر دکھائے سب قلم دوات اور کاغذ لیکر الگ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے اُسیوقت ایک اور دوست وارد ہوئے۔ مولانا سے پوچھا کہ حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں مولانا نے کہا **قل ہو اللہ** کا جواب لکھ رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریبان یا دامن یا دونو کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون ہے جسکو قدیم زمانہ سے لوگ برابر باندھتے چلے آتے ہیں ایسے چھیڑے ہوئے

مضمون کو میرؔ نے باوجود غایت درجہ کی سادگی کے ایک ایسے اچھوتے۔ نرالے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اُس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا۔ اس اسلوب میں بڑی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادہ ہے نیچرل ہے اور باوجود اسکے بالکل نو کھا ہے۔

یہاں تک اُن تین شرطوں کی شرح جنکو **ملٹن** نے شعر کے لیئے ضروری قرار دیا ہے یعنی سادگی۔ اصلیت اور جوش ہمارے نزدیک بقدرِ ضرورت بیان ہوگئی ہے **ملٹن** سے پہلے ہمارے قدما نے بھی عمدہ شعر کی تعریف میں کچھ کچھ کہا ہے **اصمعی** نے اُسکی یہ تعریف کی ہے کہ "اُسکے معنی لفظوں سے پہلے ذہن میں آجائیں" یعنی سریع الفہم ہو گویا **اصمعی** نے **ملٹن** کی تین شرطوں میں سے صرف ایک شرط یعنی سادگی پر شعر کی عمدگی کا مدار رکھا ہے۔ یہ تعریف جامع تو ہے لیکن مانع نہیں ہے۔ یعنی کوئی عمدہ شعر سادگی سے خالی تو نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ جس شعر میں سادگی ہو وہ اعلیٰ درجہ کا بھی ضرور ہو **خلیل** ابن احمد کے نزدیک عمدہ شعر کا معیار یہ ہے کہ سامع کو اُسکے شروع ہوتے ہی معلوم ہوجائے کہ اسکا فلاں قافیہ ہوگا" یہ تعریف نہ جامع ہے اور نہ مانع۔ ممکن ہے کہ شعر ادنے درجہ کا ہو اور اُسمیں یہ بات پائی جائے اور ممکن ہے کہ شعر اعلےٰ درجہ کا ہو اور اسمیں یہ بات نہ پائی جائے۔ صاحب **عقد الفرید** لکھتے ہیں کہ اس باب میں سب سے بہتر زہیر ابن ابی سلمٰی کا قول ہے۔

" وَاِنَّ اَحْسَنَ بَیْتٍ اَنْتَ قَائِلُہٗ بَیْتٌ یُقَالُ اِذَا اَنْشَدْتَہٗ صَدَقَا "

(یعنی سب سے بہتر شعر جو تم کہہ سکتے ہو وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں کہ سچ کہا ہے)

اس قول میں بھی گویا **ملٹن** کی تین شرطوں میں سے صرف ایک شرط یعنی اصلیت کو ضروری بتایا گیا ہے۔ لیکن صرف یہ ایک شرط کافی نہیں ہے اگرچہ اعلیٰ درجہ کے شعر میں یہ خاصیت ہونی ضرور ہے مگر یہ ضرور نہیں کہ جس میں یہ خاصیت پائی جائے وہ اعلیٰ ہی درجہ کا شعر ہو اس سے زیادہ اور کونسا شعر سچا ہو سکتا ہے۔

"چشمانِ تو زیرِ ابروانند — دندانِ تو جملہ در دہانند"

حالانکہ اسکو ادنے درجہ کا شعر بھی بمشکل کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس باب میں سب سے عمدہ **ابن رشیق** کا قول ہے وہ کہتے ہیں

"فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا — وَاِذَا رِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا"

(یعنی جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں) حق یہ ہے کہ **ابن رشیق** نے جس لطافت اور خوبی سے عمدہ شعر کی تعریف کی ہے اس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتی گویا جس رتبہ اور پایہ کے شعر کی اُسنے تعریف کی ہے اُسی رتبہ اور پایہ کا شعر اُس کی تعریف میں انشا کیا ہے۔

ابن رشیق اور ملٹن کے بیان میں فرق

ابن رشیق اور **ملٹن** کے بیان میں جو نازک فرق ہے اُسکو غور سے سمجھنا چاہیئے **ابن رشیق** کی تعریف سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عمدہ شعر کا سرانجام ہونا زیادہ تر حُسن اتفاق پر موقوف ہے شاعر کے قصد و ارادہ کو اُسمیں چنداں دخل نہیں ہے۔ وہ شاعر کو عمدہ شعر کہنے کا طریقہ نہیں بتاتا۔ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ شاعر کے کونسے شعر کو عمدہ شعر سمجھنا چاہیئے

بخلاف ملٹن کے کہ اُسکے بیان میں دونو پہلو موجود ہیں۔ اُس سے عمدہ شعر کی پہچان اور عمدہ شعر کہنے کی ارکان دونو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ ضرور نہیں ہو کہ ملٹن کی تینوں شرطیں ملحوظ رکھنے سے ہمیشہ ویسے ہی سہل و ممتنع اشعار سرانجام ہونگے جنکا معیار ابن رشیق نے بتایا ہے لیکن ضرور ہو کہ جو شاعر اُسکی شرطوں کو ملحوظ رکھے گا اُسکے کلام میں جا بجا وہ بجلیاں کوندتی نظر آئیں گی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جنکو اُستاد ماننا چاہیئے اُنمیں ایک بھی ایسا نہ نکلیگا جسکا تمام کلام اول سے آخر تک حسن و لطافت کے اعلے درجہ پر واقع ہوا ہو۔ کیونکہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہو سکتی ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے " وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا "۔ شاعر کی معراج کمال یہ ہے کہ اُسکا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اُسمیں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اُسکے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اُسکا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات اُسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ہے جسکا کلام سادہ اور نیچرل ہو۔ اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس بحث کو زیادہ بسط کے ساتھ بیان کیا جاتا۔ اور جسقدر کہ بیان کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک کافی مقدار سے بہت کم ہے لیکن اسوقت بضرورت صرف اسیقدر بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے اگر وقت نے مساعدت کی تو پھر کسی موقع پر اسی بحث کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا جائیگا

زمانہ کی رفتار کے موافق اردو شاعری میں ترقی کیونکر ہو سکتی ہے

یہانتک شعر و شاعری کی حقیقت اور وہ شرطیں جنپر شعر کی خوبی اور شاعر کا کمال منحصر ہے کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کی گئیں۔ اب ہم اپنے ہموطنوں کو جو زمانہ کی رفتار کے موافق شاعری میں ترقی کرنے کا خیال رکھتے ہیں اپنی سمجھ اور راے کے موافق چند مشورے دیتے ہیں۔

ظاہر ہی کہ جن ذریعوں سے ایشیا کی شاعری ہمیشہ ترقی پاتی رہی ہے وہ اُردو کی شاعری کے لیئے فی زماننا مفقود ہیں اور ہرگز امید نہیں ہے کہ کبھی زمانہ آیندہ میں ایسے ذریعے مہیا ہو سکیں بقول شخصے "وہ منڈھی ہی جاتی رہی جہاں اَتیت رہتے تھے" یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ قدرتی سرچشمہ جو ہمیشہ ہر قوم کی ترقی کا منبع رہا ہے یعنی سلف ہلپ اور اپنی ذات پر بھروسا کرنا اُسکی سوتیں بھی ہماری قوم میں مدت سے بند ہیں۔ پس ایسی حالت میں اُردو شاعری کی ترقی کا خیال پکانا گویا زمانۂ ناسازگار سے مقابلہ کرنا ہے خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ اُردو سے نہایت اعلیٰ اور اشرف زبانوں کی شاعری بھی معرض زوال میں ہو۔ سائنس اُسکی جڑ کاٹ رہا ہو۔ اور سویلزیشن اُسکا طلسم توڑ رہی ہو۔ اور اُسکے جادو کو حرف غلط کی طرح مٹا رہی ہو۔ لیکن چونکہ یاس اور اُمید دو توحالتوں میں اخیر وقت تک ہاتھ پانو مارنا جاندار کا طبیعی اقتضا ہے۔ نبض کی حرکت اور مدقوق کی امید دم واپسیں تک باقی رہتی ہی اسلیئے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اس سے یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہو گا بلکہ یہ ظاہر کرنا ہی کہ کاش ایسا ہوتا۔

شاعری کیلئے طبیعی استعداد ضروری ہے

سب سے پہلے ہم اس بات کی صلاح دیتے ہیں کہ شاعری کے کوچہ میں اُسی شخص کو

قدم رکھنا چاہیئے جسکی فطرت میں یہ ملکہ ودیعت کیا گیا ہو ورنہ تمام کاوش اور تمام کوشش رائگاں جائے گی۔ یوں تو ہر فن اور ہر پیشہ میں کمال حاصل کرنے کے لیئے مناسبت فطری کی ضرورت ہے لیکن شاعری میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اسکی سب سے زیادہ ضرورت ہے جب تک شاعر کی فکر میں اتنی بھی اُپچ نہو جتنی کہ ایک بئے میں گھونسلا بنانے کی اور مکڑی میں جالا پورنے کی ہوتی ہے اُسکو ہرگز مناسب نہیں کہ اس خیال خام میں اپنا وقت ضائع کرے بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اُسکے دماغ میں یہ خلل نہیں ہے۔

شاعری کی ابتدا بعینہ ایسی ہوتی ہے جیسی شطرنج کی ابتدا ہوتی ہے جسکی طبیعت کو شطرنج سے لگاؤ ہوتا ہے اُسکو دو ہی چار دن میں باریک اور گہری چالیں سوجھنے لگتی ہیں اور شطرنج میں اُسکو ایسا مزا آنے لگتا ہے کہ کھانا پینا اور سونا سب بھول جاتا ہے اور روز بروز اُسکی چال بڑھتی جاتی ہے مگر جن کی طبیعت کو اُس سے لگاؤ نہیں ہوتا اُن کا حال اسکے برعکس ہوتا ہے۔ وہ اگر تمام عمر شطرنج کھیلیں اُنکی چال اُس درجہ سے کبھی آگے نہیں بڑھتی جو ابتدائی چند روزہ مشق سے اُنکو حاصل ہوا تھا۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ جن لوگوں کی فطرت میں اسکا ملکہ ہوتا ہے اُنکی طبیعت ابتدا ہی سے راہ دینے لگتی ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے اُسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو طبیعت کا اقتضا اُنکو جبراً اُسکی طرف کھینچکر لاتا ہی وہ جب اُنکی طرف توجہ کرتے ہیں تو اُنکو کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوتی ہے اور اسلیئے اُنکا دل روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اُنکو اپنی قوتِ ممیّزہ پر پورا بھروسا ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کی بُرائی اور بھلائی کا بغیر اسکے کہ کسی سے مشورہ یا اصلاح لیں آپ اندازہ کرسکتے ہیں اُنکی

طبیعت میں ہر حالت اور ہر واقعہ سے خواہ وہ حالت اور واقعہ خود اُن پر گذرے۔ یا زید و عمر پر یا ایک چیونٹی پر۔ متاثر ہونے کی قابلیت ہوتی ہے اور اس قابلیت سے اگر وہ چاہیں تو بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اُنکو خارج سے اپنی شاعری کا مصالح فراہم کرنے کی صرف اُسیقدر ضرورت ہوتی ہے جسقدر کہ بئے کو اپنے گھونسلے کے لیئے پھونس اور تنکوں کے باہر سے لانے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ سلیقہ جو الفاظ و خیالات کی ترتیب و انتخاب کے لیئے درکار ہے وہ اپنی ذات میں اُسیطرح پاتے ہیں جسطرح کہ بیا گھونسلا بنانے کا ہنر اور سلیقہ اپنی ذات میں پاتا ہے۔ وہ اساتذہ کے کلام سے صرف یہی فائدہ نہیں اُٹھاتے کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا یا باندھا ہے اُس سے مطلع ہوجاتے ہیں بلکہ اُنکے ایک ایک مصرع اور ایک ایک لفظ سے بعض اوقات اُنکو وہ سبق حاصل ہوتا ہے جو ایک ناشاعر مہینوں میں کسی اُستاد سے حاصل نہیں کرسکتا پس ہمارے ملک میں جو شاعری کے لیئے ایک اُستاد قرار دینے کا دستور اور اصلاح کے لیئے ہمیشہ اُسکو اپنا کلام دکھانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردوں کے حق میں کوئی معتدبہ فائدہ مترتب ہونے کی امید نہیں ہے۔ اُستاد شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہے کہ کوئی گرامر کی غلطی بنادے یا کسی عروضی یا لغزی کی اصلاح کردے لیکن اس سے نفس شعر میں کچھ ترقی نہیں ہوسکتی۔ رہی یہ بات کہ اُستاد شاگرد کے پست کلام کو بلند کردے یا شاگرد کو اپنا ہمسر بنادے۔ سو یہ امر خود اُستاد کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے اگر اُستادوں میں شاگردوں کو اپنا ہمسر بنانے کی طاقت ہوتی تو ملّا **نظامی** صاحبزادہ کو یہ نصیحت نہ کرتے "درشعر مپیچ و در فن او ۔ کایں ختم شدست بر **نظامی**" اور اگر کمال

شاعری کے لیئے کسیکا تلمذ اختیار کرنا ضروری ہوتا تو سنائی۔ نظامی۔ سعدی۔ خسرو اور حافظ کے ضرور ایسے اُستاد نکلتے جن کی شہرت شاگردوں سے زیادہ نہیں تو اُنکے برابر یا اُنسے کمتر تو ہوتی۔

شاعر بننے کے لیئے سب سے اول سبق استعداد۔ اور پھر نیچر کا مطالعہ۔ اور اُسکے بعد کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور اُنکے برگزیدہ کلام کا اتباع کرنا۔ اور اگر میسر آسکے تو اُن لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونا جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں (عام اس سے کہ شاعر ہوں یا نہوں) صرف اسیقدر کافی ہے اور بس۔ البتہ اُن لوگوں کو جو مستند زبان پر کافی عبور نہیں رکھتے ممکن ہے کہ محاورات کے استعمال میں شبہات واقع ہوں لیکن ان شبہات کا رفع ہونا کسی مشاق و ماہر اُستاد پر موقوف نہیں ہے بلکہ وہ ہر صاحب زبان سے یہانتک کہ ایک دَدَا۔ ایک ماماں۔ ایک کُنجڑن بلکہ ایک حلال خوری سے بھی رفع ہوسکتے ہیں۔

جھوٹ اور مبالغہ سے بچنا چاہیے

دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ شعر میں جہانتک ممکن ہو حقیقت اور راستی کا سر رشتہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہیئے۔ اگرچہ ہمنے جو **اصلیت** کی شرح اور بیان کی ہے اُسمیں دائرۂ بیان کو زیادہ وسیع کر دیا ہے اور اصلیت کے لیئے بہت سے پہلو نکالے ہیں لیکن زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ جھوٹ۔ مبالغہ۔ بہتان۔ افترا۔ صریح خوشامد۔ ادعاے بےمعنی تعلی بےجا۔ الزام لایعنی۔ شکوۂ بےمحل اور اَور اسی قسم کی باتیں جو صدق و راستی کی منافی ہیں اور جو ہماری شاعری کے قوام میں داخل ہوگئی ہیں۔ اُنسے جہانتک ممکن ہو قاطبۃً احتراز کیا جائے یہ سچ ہے کہ ہماری شاعری میں خلفائے عبّاسیّہ کے زمانہ سے لیکر آج تک جھوٹ اور مبالغہ

برابر ترقی کرتا چلا آیا ہے اور شاعر کے لیئے جھوٹ بولنا صرف جائز ہی نہیں رکھا گیا بلکہ اُسکی شاعری کا زیور سمجھا گیا ہے لیکن ہمیں بھی شک نہیں کہ جب سے ہماری شاعری میں جھوٹ اور مبالغہ داخل ہوا اُسیوقت سے اُسکا تنزل شروع ہوا عرب عربا اور صدر اول کے شعرا جھوٹ سے نہایت نفرت کرتے تھے اور اُسکو عیوبِ شاعری میں سے سمجھتے تھے زُہیر ابن ابی سلمی جو صدر اول کا شاعر ہے اُسکا قول ہے کہ "احسن القول ما صدقہ الفعل" یعنی سب سے بہتر کلام وہ ہی جسپر کام گواہی دیں۔ اور اسی شاعر کا یہ مشہور شعر ہے۔

"وَاِنَّ اَشْعَرَ بَیْتٍ اَنْتَ قَائِلُہٗ بَیْتٌ یُقَالُ اِذَا اَنْشَدْتَہٗ صَدَقَا"

اُسی زُہیر کی نسبت حضرت عمر فاروق رض کہا کرتے تھے "اِنَّہٗ اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ لِاَنَّہٗ لَا یَمْدَحُ اِلَّا مُسْتَحِقًّا" (یعنی وہ افضل ترین شعرا ہے کیونکہ وہ اُسی کی مدح کرتا ہے جو مستحق مدح ہو) ایکبار بنی تمیم نے سلامۃ بن جندل سے جو ایک جاہلی شاعر ہے درخواست کی کہ "مَجِّدْنَا بِشِعْرِکَ" (یعنی تو اپنے مدحیہ اشعار سے ہماری عزت بڑھا) اُسنے کہا "اِفْعَلُوْا حَتّٰی اَقُوْلَ" (یعنی تم کچھ کرکے دکھاؤ تاکہ میں اُسکو بیان کروں)

صاحب عقد الفرید لکھتے ہیں کہ "شعراے عرب اپنی مدح سے ممدوحوں کی عزت بڑھا دیتے تھے اور ہجو سے لوگوں کو ذلیل و رُسوا کر دیتے تھے" اسکا سبب اسکے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ اُنکی واقعی خوبیاں یا واقعی بُرائیاں بیان کرتے تھے۔ ورنہ جھوٹی مدح اور جھوٹی ہجو سے کوئی شخص عزیز یا ذلیل نہیں ہو سکتا۔

معاویہ بن ابی سفیان کہتے ہیں کہ "شعر وہ چیز ہے جسکے پڑھنے سے بخیل

فیاض۔ نامرد بہادر۔ اور نااہل بیٹا اہل و رفرمانبردار ہوجاتا ہے" ظاہر ہے کہ اس تعریف کا مصداق اگر کوئی شعر ہوسکتا ہے تو وہی ہوسکتا ہے جو جھوٹ اور مبالغہ سے پاک ہو ابونواس نے خلیفہ کی مدح میں یہ شعر کہدیا تھا "وَاَخَفْتَ اَهْلَ الشِّرْكِ حَتّٰى اَنَّهٗ + لَتَخَافُكَ النُّطَفُ الَّتِیْ لَمْ تُخْلَقِ"

(یعنی تو نے اہل شرک کو ایسا ڈرایا ہے کہ جو نطفے ہنوز قرار نہیں پائے وہ صلب پدر ہی میں تجھ سے خوف کھاتے ہیں) اس پر لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ جو نطفے ہنوز قرار نہیں پائے وہ کیونکر خوف کھاسکتے ہیں اور ابونواس کی طرف سے سوا اسکے کہ بعضوں نے تاویل سے اُسکو صحیح قرار دیا اور کوئی کچھ جواب نہ دے سکا۔

سچا شعر کہنے کی صلاح کچھ اسلیے نہیں دیجاتی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ نہیں بلکہ اسلیے دیجاتی ہے کہ تاثیر جو شعر کی علت غائی ہے وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی۔ اِسکے سوا علوم و معارف کی ترقی جو آج کل دنیا میں ہورہی ہے وہ جھوٹی شاعری کی برباد کرنے والی ہے۔ جن ڈھکوسلوں پر پرانے مذاق کے لوگ ابھی تک سر دھنتے ہیں کوئی دن جاتا ہے کہ وہ دیوانوں کی بڑ سمجھے جائینگے۔

نیچرل شاعری

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو نیچرل شاعری کا لفظ اکثر لوگوں کی زبان سے جاری ہے اُسکی کسیقدر شرح کیجائے۔ بعض حضرات تو **نیچرل شاعری** اُس شاعری کو سمجھتے ہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو یا جسمیں نیچریوں کے مذہبی خیالات کا بیان ہو۔ بعضے یہ خیال کرتے ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جسمیں خاص مسلمانوں کی یا مطلقاً کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا ذکر کیا جائے۔ مگر نیچرل شاعری سے یہ دونو معنی کچھ علاقہ نہیں رکھتے **نیچرل شاعری** سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنًی دونو حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو

لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور اُنکی ترکیب و بندش تا بمقدور اُس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جسمیں وہ شعر کہا گیا ہے کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اُس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں پس شعر کا بیان جسقدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اُسیقدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنیً نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کیجائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اسکے خلاف ہوگا وہ اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ مثلاً

میر حسن

"کوئی رکھ کے زیرِ زنخدان چھڑی ہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی"

"رہی کوئی اُنگلی کو دانتوں میں داب کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب"

ان دونو شعروں کو نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے وہاں ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ یا مثلاً

ذوق

"رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ جسطرح آشنا سے کرے آشنا صلاح"

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت انسان اپنے دل سے اسیطرح مشورہ کیا کرتا ہے یا مثلاً

مصحفی

ترے رخسار و گیسو سے بتا تشبیہہ دوں کیونکر نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہی سنبل میں بو ایسی

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بو معشوق کے رنگ و بو سے بہتر یا اُسکے برابر نہیں معلوم ہوتی یا مثلاً

مومن

"تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھجاتا ہے اُسکا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً

ناسخ

"طبیعت کوئی دن میں بھر جائیگی چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی"

"رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی"

ان دونو شعروں کا مضمون گو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتا ہے۔ مگر دونو اپنی اپنی جگہ نیچر کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا و ہوس کا بھوت بڑے زور و شور کے ساتھ سر چڑھتا ہے مگر بہت جلد اُتر جاتا ہے اور فی الواقع دنیا کی خواہشوں سے کبھی نیت سیر نہیں ہوتی۔ یا مثلاً

غالب

"رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹجاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہوگئیں"

یہ شعر بھی نیچرل ہے۔ اور فطرت انسانی کی کسیقدر گہری اور پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا ہے جسکے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اُس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے ایسے ہیں جنکو لفظاً اور معنًی دونو حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہیئے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں جنکو لفظاً یا معنًی یا دونو حیثیتوں سے نیچرل نہیں کہا جا سکتا مثلاً

ناسخ

"کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی ہے دھیان مژہ دلکو کبھی ہیں خار پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں"

اس شعر کو صرف لفظاً نیچرل کہا جا سکتا ہے لیکن معنًی نہیں کہا جا سکتا معشوق کے تصور سے بلاشبہہ عاشق کو فرحت بھی ہو سکتی ہے اور رنج بھی۔ لیکن جب فرحت ہو تو عارض اور مژگان

دونوں کے تصور سے فرحت ہونی چاہیئے۔ اور جب رنج ہو تو دونوں کے تصور سے رنج ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پلکیں جو خار سے مشابہ ہیں اُنکے تصور سے پہلو میں خار رہوں اور عارض جو گل سے مشابہ ہے اُسکے تصور سے پہلو میں گلزار ہو۔ یا مثلاً

غالب — عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

جوہر اندیشہ میں کیسی ہی گرمی ہو یہ کسیطرح ممکن نہیں کہ اُسمیں صحرانوردی کا خیال آنے سے خود صحرا جل اُٹھے۔ یا مثلاً

امیر — کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گل سے کوئی پھول — آتشِ گل سے پڑے چھالے تمھارے ہاتھ میں

نزاکت کسی درجہ کی کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ آتشِ گل یعنی خود گل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑجائیں۔ یا مثلاً

ذوق — دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری — بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

سرد مہری میں اتنی ہی ٹھنڈک ہوسکتی ہے جتنی کہ لفظ **سرد** میں۔ پھر اُسکے کشتہ کی خاک میں اتنا اثر ہونا کہ اُس سے شجر کافور پیدا ہو۔ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں جنمیں معنی کا بالکل نام ونشاں نہیں۔

ہر زبان میں **نیچرل شاعری** ہمیشہ قدما کے حصہ میں رہی ہے۔ مگر قدما کے اول طبقہ میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ انھیں کا دوسرا طبقہ اُسکو سڈول بناتا ہے اور سانچے میں ڈھالکر اُسکو خوشنما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے مگر اُسکی نیچرل حالت کو اس خوشنمائی اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ انکے بعد متاخرین

کا دورہ شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں رکھتے اور خیالات کے اسی دائرہ میں محدود رہتے ہیں جو قدما نے ظاہر کیے تھے اور نیچر کے اُس منظر سے جو قدما کے پیش نظر تھا آنکھ اُٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے تو اُنکی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل حالت سے تنزل کرتی ہے یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہ راست سے بہت دور جا پڑتے ہیں اسکی مثال ایسی سمجھنی چاہیے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم۔ کچے اور الونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ انھیں پانی میں اُبال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اسکو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو۔ اگر وہ دال ہی کے پکانے میں اپنی اُستادی ظاہر کرنی چاہتا ہے اسکے سوا اور کوئی موقع تنوع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا۔ کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے۔

اسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دلنشین کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ فارسی زبان میں جسپر اُردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اول غزل لکھی ہوگی ضرور ہے کہ اُنھوں نے عشق و محبت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادے طور پر معشوق کی صورت۔ حُسن و جمال نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا۔ اُنکے بعد لوگوں نے انھیں باتوں کو مجاز اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان کیا۔ مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزۂ و ناز و ادا کو مجازاً تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور اس جدت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف با مزہ ہو گیا

متاخرین جب اسی مضمون پر پل پڑے اور اُنکو قدما کے استعارہ سے بہتر کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا اور جدّت پیدا کرنے کا خیال دامنگیر ہوا۔ اُنھوں نے تیغ و شمشیر کے مجازی معنوں سے قطع نظر کی اور اُس سے خاص سروہی یا اصیل تلوار مراد لینے لگے جو قبضہ۔ باڑ۔ پیپلا۔ آب اور نیام اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے۔ میان میں رہتی ہے۔ گلے میں حمایل کیجاتی ہے۔ زخمی کرتی ہے۔ ٹکڑے اُڑاتی ہے۔ سر اتارتی ہے۔ خون بہاتی ہے۔ پور نگ کاٹتی ہے اُسکی دھار تیز بھی ہوسکتی ہے اور کُند بھی۔ قاتل کا ہاتھ اُسکے مارنے سے تھک سکتا ہے وہ قاتل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے۔ اُسکے مقتول کا مقدمہ عدالت میں دائر ہوسکتا ہے اُسکا قصاص لیا جاسکتا ہے۔ اُسکے وارثوں کو خون بہا دیا جاسکتا ہے۔ غرضکہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں ہوسکتے ہیں وہ سب اُسکے لیئے ثابت کرنے لگے۔

یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہوجانے کو مجازاً دل دادن یا دل باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا رفتہ رفتہ متاخرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ سے چھینا جاسکتا ہے۔ واپس لیا جاسکتا ہے۔ کھویا اور پایا جاسکتا ہے۔ کبھی اُسکی قیمت پر تکرار ہوتی ہے۔ سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے۔ ورنہ نہیں دیا جاتا کبھی اُسکو معشوق عاشق سے لیکر کسی طاق میں ڈالکر بھول جاتا ہے۔ اتفاقاً وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہ آنکھ بچا کر وہاں سے اُڑا لاتا ہے۔ پھر معشوق کے ہاں اُسکی ڈھنڈیا پڑتی ہے اور عاشق اُسکی رسید نہیں دیتا۔ کبھی وہ یاروں کے جلسہ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہوجاتا ہے۔ سارا گھر چھان مارتے ہیں کہیں پتا نہیں لگتا۔ اتفاقاً معشوق جو

بالوں میں کنگھی کرتا ہے تو وہ جوں کیطرح جھڑ پڑتا ہے۔ کبھی وہ ایسا تلپٹ ہو جاتا ہے کہ زلف یار کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اُسکی تلاش کیجاتی ہے۔ مگر کہیں کچھ سراغ نہیں ملتا کبھی وہ بیع بالخیار کے قاعدے سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے کہ پسند آئے تو رکھنا ورنہ پھیر دینا۔ اور کبھی اُسکا نیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے وہی لیجائے۔

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اسلیئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے مجازاً صیاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اُسپر تمام احکام حقیقی صیاد کے مترتب کر دیئے۔ اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے۔ کہیں اُسکو تیر مار کر گراتا ہے۔ کہیں اُنکو زندہ پنجرے میں بند کرتا ہے کہیں اُنکے پر نوچتا ہے کہیں اُنکو ذبح کر کے زمین پر تڑپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر کمان لگا کر جنگل کیطرف جا نکلتا ہے۔ تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اُس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سیکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا۔ بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں اور لُؤوں اور بٹیروں کے اُس کے دروازہ پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے چڑی مار اُسکے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشق الٰہی یا محبت روحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ مجازاً شراب کے نشہ سے تعبیر کیا تھا اور اس مناسبت سے جام و صراحی۔ خُم و پیمانہ اور ساقی و میفروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کیئے تھے یا بعض شعرائے متصوفین نے شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اس دار الغرور کے تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ البال کرنے والی ہے بطور تفاول کے موصل الی المطلوب قرار دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اور اُسکے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ شاعرہ

بلا مبالغہ کلال کی دکان بنگئی۔ ایک کہتا ہے لا۔ دوسرا کہتا ہے اور لا۔ تیسرا کہتا ہے پیالہ نہیں تو اوک ہی سے پلا۔ کچھ بہک رہے ہیں اور کچھ بکار رہے ہیں کوئی واعظ پر پھبتی کہتا ہے کوئی زاہد کی داڑھی پر ہاتھ لپکاتا ہے۔ کوئی شیخ کی پگڑی اچھالتا ہے۔ جوان اور بوڑھے جاہل اور عالم رند اور پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جو ہے سو نشہ کے خمار میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جدھر دیکھو العطش العطش کی پکار ہے۔

یا مثلاً قدما نے لاغری بدن کو اندوہ عشق یا صدمہ جدائی کا ایک لازمی نتیجہ سمجھکر اسکو کسی موثر طریقہ سے بیان کیا تھا۔ متاخرین نے رفتہ رفتہ اسکی نوبت یہانتک پہنچادی کہ فراش جھاڑو دیتا ہے تو خس و خاشاک کے ساتھ عاشق زار کو بھی سمیٹ لیجاتا ہے معشوق جب صبح کو اٹھتا ہے تو عاشق کو لاغری کے سبب بستر پر نہیں پاتا۔ لاچار بچھونا جھاڑکر دیکھتا ہے تاکہ زمین پر کچھ گرتا ہوا معلوم ہو۔ عاشق کو موت ڈھونڈھتی پھرتی ہے مگر لاغری کے سبب وہ اسکو کہیں نظر نہیں آتا۔ میدان قیامت میں فرشتے چاروں طرف ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور قاضی یوم الحساب منتظر بیٹھا ہے مگر عاشق کا لاغری کے سبب کہیں پتا نہیں ملتا۔

اسیطرح متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندھ گئے تھے نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا۔ معشوق کے دہانہ کو تنگ کرتے کرتے صفحہ روزگار سے یکقلم مٹا دیا۔ کمر کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کردیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمر خضر سے بھی بڑھا دیا۔ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بدگمان بنگئے۔ جدائی کی رات کو

طول دیتے دیتے ابر سے جا بھڑایا۔ الغرض جب پچھلے انھیں مضامین کو جو اگلے باندھ گئے ہیں اوڑھنا اور بچھونا بنا لیتے ہیں تو اُنکو مجبورا نیچرل شاعری سے دست بردار ہونا اور سیل کا بیل بنانا پڑتا ہے۔

اس بات کے زیادہ ذہن نشین کرنیکے لیئے (کہ شاعری کا آغاز کس حالت میں ہوتا ہے اور پھر قدما کا دوسرا طبقہ اُسکو کسطرح اُسی نیچرل حالت میں درست کرتا ہے اور اُنکے بعد متاخرین اُسکو کیا چیز بنا دیتے ہیں) اُردو شعرا کے ہر طبقہ کے کلام میں سے کچھ کچھ مثالیں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی مثال شاہ آبرو جو اُردو شعرا کے سب سے پہلے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں وہ اُس کیفیت کو جو معشوق کے دیکھنے سے عاشق کے دلمیں پیدا ہوتی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

نَین سیں نَین جب ملائے گیا   دل کے اندر مرے سمائے گیا
نگہِ گرم سیں مرے دل میں   خوش نَین آگ سی لگائے گیا

مرزا رفیع **سودا** جنکو دوسرے طبقہ میں شمار کرنا چاہیئے وہ اسی کیفیت کو اسطرح بیان کرتے ہیں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ   کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

میر تقی جو مرزا رفیع کے معاصر ہیں وہ اسی کیفیت کو یوں ادا کرتے ہیں۔

نہیں ہی چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر   کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آوے

خواجہ حیدر علی **آتش** جنکو چوتھے یا پانچویں طبقہ میں سمجھا گیا ہے وہ اسی کیفیت کو یوں

بیان فرماتے ہیں۔

تختۂ نردِ عشق دل کھیلا جو حسنِ یار سے چھُٹ گئے ایسے مرے چھکے کہ ششدر ہو گیا

دوسری مثال۔ شاہ آبرو اُس طولِ مدت کو جو مفارقت کے زمانہ میں عاشق کو محسوس ہوتا ہے اسطرح بیان کرتے ہیں۔

جدائی کے زمانہ کی سجن کیا زیادتی کہیے کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جُگ بیتا

اسی مضمون کو میر نے یوں ادا کیا ہے

ہر آن ہمکو تجھ بن ایک اک برس ہوئی ہے کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ

ناسخ جو پانچویں طبقہ میں ہیں وہ اِس مضمون کو یوں باندھتے ہیں۔

جائے کافورِ سحر چاہیئے کافورِ حنوط یہ شبِ ہجر ہے یاروشبِ دیجور نہیں

یعنی شبِ ہجر جب تک ہماری جان نہ لیگی ٹلنے والی نہیں ہے۔ پس کافورِ سحر کی توقع رکھنی عبث ہے بلکہ اُسکی جگہ کافورِ حنوط غُسلِ میت کے لیئے درکار ہے۔ اگرچہ مضمون کے لحاظ سے تینوں شعروں کو نیچرل کہا جاسکتا ہے کیونکہ شوق و انتظار کی حالت میں ممکن ہے کہ عاشق کو ایک ایک گھڑی جُگ اور ایک ایک آن برس کے برابر معلوم ہو اور ممکن ہے کہ عاشق طولِ شبِ فراق سے تنگ آکر جینے سے مایوس ہو جائے۔ مگر ناسخ کی طرزِ بیان اردو کی معمولی بول چال سے اسقدر بعید ہے کہ اُسکو کسیطرح نیچرل بیان نہیں کہا جاسکتا۔

تیسری مثال شاہ حاتم جو پہلے طبقہ میں شمار کیئے گئے ہیں وہ دوست کے ملنے کی آرزو اور اُسکے دیکھنے کے شوق کو اسطرح بیان کرتے ہیں۔

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم　　کب ملے گا مجھے پیا میرا

اسی مضمون کو **میر** نے یوں باندھا ہے۔

وصل اُس کا خدا نصیب کرے　　میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

سودا یوں کہتے ہیں۔

دل کو یہ آرزو ہے صبا کوے یار میں　　ہمراہ تیرے پہنچے مل کر غبار میں

منشی امیر احمد صاحب **امیر** جو موجودہ طبقہ کے مشہور شاعر ہیں وہ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

واکردہ چشم دل صفتِ نقش پا ہوں میں　　ہر رہگذر میں راہ تری دیکھتا ہوں میں

اس مثال میں بھی تینوں شعروں کو اگرچہ خیال کے لحاظ سے نیچرل کہا جا سکتا ہے مگر اخیر شعر کے بیان میں بمقابلہ **حاتم** اور **میر** و **مرزا** کے صاف تصنع اور ساختگی پائی جاتی ہے اور بیان نیچرل نہیں رہا۔ اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو اس سے بہت زیادہ صریح اور صاف مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں۔

اوپر کے بیان سے یہ ہرگز سمجھنا نہیں چاہئے کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ ان نیچرل ہوتی ہے نہیں بلکہ ممکن ہے کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو قدما کی جولانگاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں۔ یا اُسی جولانگاہ کو کسیقدر وسعت دیں۔ یا زبان میں بہ نسبت متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت و صفائی پیدا کر سکیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ **لکھنؤ** میں **میر انیس** نے مرثیہ کو بے انتہا ترقی دی ہے اور **نواب مرزا**

شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔ اسیطرح **دلی** میں **ذوق**۔ **ظفر** اور خاصکر **داغ** نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کردیا ہے جیسا کہ ہم آگے چلکر کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔

زبان کو درستی سے استعمال کرنا

تیسری بات زبان اُردو کو درستی اور صفائی کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔ اگرچہ اُردو کم و بیش تمام اطراف ہندوستان میں متداول ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض ممالک کے باشندے اپنی خاص زبان میں بہ نسبت اُردو زبان کے زیادہ آسانی سے شعر سرانجام کرسکیں۔

پس اگر ہمارے ہموطنوں میں کوئی شخص اپنی خاص زبان میں شعر کہنا چاہے تو اِس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ مادری زبان سے بہتر اور سہلتر کوئی آلہ اظہار خیالات کا نہیں ہوسکتا۔ لارڈ مکالے کا قول ہے کہ ”کوئی عمدہ کلام جو خیالات کا مجموعہ ہو کبھی کسی شخص نے سرانجام نہیں کیا مگر ایسی زبان میں جسکی نسبت اُسکو مطلق یاد نہ ہو کہ کب سیکھی اور کیونکر سیکھی اور جسکی گرئمر جاننے سے پہلے وہ ایک مدت تک اُسمیں گفتگو کرتا رہا“ وہ لکھتے ہیں کہ ”روما کے بڑے بڑے لایق آدمیوں نے فرانسیسی زبان میں اشعار لکھے مگر اُنمیں سے کوئی شعر صفحہ روزگار پر یادگار نہ رہا۔ انگلستان کے بہت سے خوش فکر اور طباع آدمیوں نے لاطینی میں دیوان مرتب کیے مگر اُنمیں سے ایک دیوان بھی یہانتک کہ ملٹن کا دیوان بھی شاعری کے لحاظ سے اول درجہ کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ دوسرے درجہ میں بھی کچھ امتیاز نہیں رکھتا“ پس جبکہ ملکہ شاعری ایک فطری اور جبلّی چیز ہے۔ اسیطرح اُسکو کام میں لانے کے لیئے ایسے آلہ کا استعمال

زیادہ مناسب ہوگا جو بمنزلہ فطری اور جبلی چیز کے ہو اور وہ مادری زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔

لیکن چونکہ اُردو زبان ہندوستان کی اور تمام زندہ زبانوں کی نسبت بالاتفاق زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لایق ہے۔ تمام اطراف ہندوستان میں عمومًا بولی اور سمجھی جاسکتی ہے۔ اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اُسی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے اور جہانتک ممکن ہو اُسیکو ترقی دیجائے۔ نیز اُسکا حاصل کرنا اور اُسمیں کافی مہارت بہم پہنچانی ہندوستان کے باشندوں کو اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ اَور غیر مادری زبانوں میں دشوار ہوتی ہے۔

اسکے سوا ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں بالفعل کوئی زبان ایسی نہیں معلوم ہوتی جسمیں اُردو کے برابر شعر کا ذخیرہ موجود ہو۔ اسلیئے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہموطنوں میں جو شخص شعر کہنا اختیار کرے وہ اُردو ہی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ قرار دے۔

ہندوستان میں جیسا کہ عمومًا تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہانکی اُردو معتبر سمجھی جاتی ہے **دلّی** اور **لکھنؤ**۔ **دلّی** کی زبان اسلیئے ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے کہ اُردو کا حدوث اور نشو و نما اسی خطہ میں ہوا ہے۔ **لکھنؤ** کی زبان کو اسواسطے مُستند مانا جاتا ہے کہ سلطنت مُغلیہ کے زوال کی ابتدا سے شرفاے دہلی کے بے شمار خاندان ایک مدت دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لیئے وہیں رہ پڑے۔ پس ہندوستان کے کسی

شہر کو اہل دہلی سے اسقدر میل جول کا موقع نہیں ملا جسقدر کہ لکھنؤ کو ملا ہے۔ یہاں تک کہ دونو شہروں کی زبان میں ایک خاص مماثلت پیدا ہو گئی ہے۔ اور خاص خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونو جگہ کی بول چال اور لب و لہجہ میں کوئی معتد بہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

کوئی زبان تمام ملک میں یکساں طور پر اُسوقت تک شائع نہیں ہو سکتی جبتک کہ مندرجہ ذیل ذریعے ملک میں مہیا نہ ہوں۔ ۱۔ اُس زبان کی معتبر اور جامع ڈکشنری کا تیار ہونا ۲۔ اُسکی جامع گرمیر کا مرتب ہونا ۳۔ اُسمیں کثرت سے نظم و نثر کی کتابوں کا تصنیف و تالیف ہو کر شائع ہونا۔ ۴۔ اُس زبان کے اخبارات و رسائل کا تمام اطراف و جوانب ملک میں اشاعت پانا ظاہر ہے کہ نہ آجتک اُردو کی کوئی جامع اور مستند ڈکشنری تیار ہوئی ہے اور نہ اُسکی کوئی ایسی گرمیر لکھی گئی ہے جس سے زبان کے سیکھنے میں کافی مدد ملنے کی امید ہو۔ اُردو میں تصنیف و تالیف کا رواج اور اخبارات وغیرہ کی اشاعت زیادہ تر بیس پچیس برس سے ہوئی ہے اور اسقدر قلیل مدت زبان کی ترویج کے لیئے کافی نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اُردو لٹریچر کی جسقدر اشاعت ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے اُسیقدر اردو زبان کی تحریر اور نظم و نثر لکھنے کا سلیقہ اطراف ہندوستان میں عموماً بڑھتا جاتا ہے لیکن شاعرانہ خیالات اور خاصکر نیچرل شاعری کے فرائض ٹکسالی زبان میں ادا کرنے کے لیئے ایسے محدود ذریعے شاید کافی نہ ہوں اگرچہ ایک جامع اور مستند ڈکشنری بھی اگر کوئی ہو اس مقصد کے پورا کرنے میں بہت کچھ مدد پہنچا سکتی ہے۔ مگر اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور اُنکی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ اُنکے الفاظ

و محاورات بقدر معتد بہ نامعلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں لیکن چونکہ ایسا موقع ہر شخص کو ملنا دشوار ہے اسلیئے ضرور ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جسقدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے نہ اس ارادہ سے کہ خیالات اور مضامین میں اُنکی تقلید کیجائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کسطرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔

ابن خلدون کہتے ہیں کہ "ایک عجمی فصحائے عرب کے کلام کی ممارست سے اہل زبان میں شمار کرنیکے لایق ہوسکتا ہے" پس ہندوستان کے باشندے اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اہل زبان کے کلام کی مزاولت سے مثل اہل زبان کے سمجھے جائیں۔

اگرچہ دلی کے بہت سے عمدہ شاعروں کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ جیسے خواجہ میر اثر شاہ نصیر۔ میر ممنون معروف۔ عارف وغیرہ۔ حالانکہ ان بزرگواروں کے مبسوط اور ضخیم دیوان موجود ہیں۔ لکھنؤ میں بھی کچھ عجب نہیں کہ وہاں کے بعض مستند لوگوں کا کلام شائع نہوا ہو۔ لیکن جن لوگوں کے دیوان اور کلیات شائع ہوچکے ہیں اُنکی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے اور اُنہیں سے خاصکر میر۔ سودا۔ درد۔ جرأت۔ انشا۔ مصحفی۔ میر حسن۔ ناسخ۔ آتش وزیر۔ غالب۔ ذوق۔ ظفر۔ شیفتہ۔ داغ۔ سالک۔ شوق[8]۔ رند۔ اسیر۔ برق۔ امیر وغیرہم کا ہر قسم کا کلام خواہ غزل ہو خواہ مثنوی خواہ قصیدہ خواہ قطعہ و رباعی خواہ واسوخت سب دیکھنا چاہیئے۔ اور سب سے زیادہ اہم اور ضروری خلیق۔ ضمیر۔ انیس۔ دبیر اور

---

[8] شوق سے مراد نواب مرزا لکھنوی ہے۔ جس کی بہار عشق و زہر عشق وغیرہ مثنویاں مشہور ہیں ۱۲

سونس و غیرھم کے مرثیوں کا مطالعہ ہی۔ اگرچہ بعضے دیوان اور مثنویاں جنکا اوپر ذکر کیا گیا سراسر لغو خیالات اور بیہودہ مضامین سے بھری ہوئی ہیں لیکن جو لوگ محض زبان سے غرض رکھتے ہیں اُنکو خیالات کی لغویت اور مضامین کی بیہودگی سے چشم پوشی اور اغماض کرنا چاہیئے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ و محاورات اور طرز ادا اور انداز بیان پر ہمت مقصور رکھنی اور خُذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کرنا چاہیئے۔ نظم کے علاوہ اُردو لٹریچر میں جسقدر علمی۔ تاریخی۔ مذہبی اور اخلاقی مضامین پر مستند اہل زبان نے کتابیں لکھی ہیں اُنسے بھی فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

جو لوگ اپنے تئیں اُردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ اُنکو اس بات پر فخر کرنا نہیں چاہیئے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں۔ اور ہمارے روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے اُنکو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لینگے۔ اُسکے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچاینگے۔ اُسکے الفاظ و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کرینگے اور اُسکی نظم و نثر کو زمانہ کے مذاق کے موافق ترقی نہ دینگے تو اُنکی زبان کا وہ حصہ جسپر اُنکو فخر ہے اور جو اُنکی اور تمام ہندوستان کی اُردو میں مابہ الامتیاز ہے وہ حرفِ غلط کی طرح صفحہ روزگار سے محو ہو جائے گا۔ اور یہی بُری بھلی اُردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعے سے ملک میں پھیل رہی ہے اور جسکو وہ ابتک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں یہی۔ ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پا جائے گی۔ کیا اُنکو معلوم نہیں ہی کہ عرب میں جب سے شعر و انشا کی سرد بازاری ہوئی اور عربی نظم و نثر کے مالک غیر

ملکوں کے باشندے ہوگئے رفتہ رفتہ وہ کلیسکل عربی جسپر عربوں کو ناز تھا لٹریری دنیا سے رخصت ہوگئی اور وہی بیجھڑی زبان جسکو عرب عربا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے تمام عربی لٹریچر پر چھا گئی اور شام و روم و مصر و بربر و سودان وغیرہ میں عموماً پھیل گئی۔ یہانتک کہ آج وہی زبان ٹکسالی اور فصیح عربی سمجھی جاتی ہے۔ ایسا ہی انجام **دلّی** اور **لکھنؤ** کی زبان کا اگر اُسکی جلد خبر نہ لی گئی ہوتا نظر آتا ہے۔ دلّی جسکو اُردوے معلی کا مسقط الراس اور جنم بھوم کہنا چاہیئے وہاں مصنف اور ناظم و ناثر پیدا ہونے موقوف ہوگئے ہیں۔ پرانے لوگوں میں سے چند نفوس جنکو چراغ سحری سمجھنا چاہیئے باقی رہ گئے ہیں اُنکے بعد بالکل سنّاٹا نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کا حال اگرچہ بظاہر ایسا نہیں معلوم ہوتا وہاں شاعری کا چرچا دلّی سے بہت زیادہ سننے میں آتا ہے۔ وہاں سے نوول اور ڈراما برابر ملک میں شائع ہوتے رہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ اُنکا قدم زمانہ کی رفتار کے متوازی نہیں اُٹھتا۔ وہ جسقدر آگے بڑھتے جاتے ہیں اُسیقدر ترقی کے رستے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیئے صرف دلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اُردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اُسکے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اُردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے۔ نیز اُردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق

نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔

زبان کے متعلق ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے۔ نیچرل شاعری کے لیئے جیسا کہ ظاہر ہے ہماری موجودہ زبان کافی نہیں ہے اسلیئے ضرور ہے کہ اُسمیں وسعت پیدا کیجائے۔ پس اہل لکھنو جو زبان کے دائرہ کو روز بروز زیادہ تنگ کرتے جاتے ہیں یہ امر مقتضائے وقت کے بالکل خلاف ہے۔ لکھنو میں ایک صاحب نے ۱۸۹۰ء میں ایک رسالہ شعر و سخن کے متعلق لکھا ہے اُسمیں کچھ اوپر پچاس لفظ ایسے لکھے ہیں جنکو خود صاحب رسالہ یا اور اہل لکھنو واجب الترک خیال کرتے ہیں بعضے اُنمیں سے خاص لکھنو کے ساتھ مختص ہیں۔ اہل دہلی کبھی اُسطرح نہیں بولتے جیسے **اندھیارا۔ اندھیرے** کی جگہ **اُجیالا اُجالے** کی جگہ **کیونکر سے۔ کیونکر** کی جگہ۔ ایسے الفاظ کا ترک کرنا ہم بھی نہایت مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے لکھنو اور دلی کی زبان میں مطابقت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اہل لکھنو ایسے الفاظ ترک کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم اور بہت سے الفاظ حاضر کر سکتے ہیں۔ ایسے الفاظ ترک کرنے سے زبان کی وسعت میں بھی کچھ ایسا فرق نہیں آتا۔

اسی رسالہ میں بعضے ایسے الفاظ کو واجب الترک قرار دیا ہے جو اصل زبان کی گرامر یا قیاس لغوی کے خلاف برتے اور بولے جاتے ہیں جیسے **موسم** بفتح سین۔ یا **منّت**

بفتح یا ۔ یا نشا بروزنِ وفا کہ عربی گریمر یا لغت کے موافق موسم بروزن مسجار ۔ اور نشیت بکسرۂ یا اور نشأۃ بروزن وحدت ہی ۔ لیکن فی الحقیقہ یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علم لسان کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے ۔ انکو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہوکر کبھی اپنی اصلی صورت پر قائم نہیں رہ سکتے ۔ الا ماشاء اللہ ۔ دور کیوں جاؤ ۔ ہماری اردو ہی میں ہزاروں لفظ سنسکرت ۔ پراکرت اور بھاشا کے داخل ہیں ۔ باوجود اسکے شاذ و نادر ہی ایسے الفاظ نکلینگے جو اپنی اصلی صورت پر قائم ہوں مثلاً گھر ۔ گھڑا ۔ اُجلا ۔ آدھا ۔ اندھیرا ۔ آسرا ۔ آنکھ ۔ آگے ۔ اُنگلی ۔ یہ تمام الفاظ سنسکرت کے مفصلۂ ذیل الفاظ سے بگڑے ہوئے ہیں یعنی گرِہ گھٹ اُجّل ۔ اَردھ اندھکار ۔ آشرے ۔ اکھشی ۔ اگر ۔ انگرو ۔ اسیطرح پراکرت اور بھاشا کے صدہا لفظ اپنی اصل کے خلاف ہماری زبان میں مستعمل ہیں ۔ مگر چونکہ اُن کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں اس لیئے اُنکو صحیح سمجھکر بے تکلف بولتے اور برتتے ہیں ۔ لیکن عربی یا فارسی جس سے کہ اُنکو فی الجملہ واقفیت ہی جہاں اُسکا کوئی لفظ اصل زبان کے خلاف کسی کی اردو نظم یا نثر میں دیکھا اور فوراً ناک چڑھائی ۔ حالانکہ خود عربی کے بہت سے الفاظ اصل وضع کے خلاف استعمال کرتے ہیں مثلاً غش بجاے غَشی مُسلمان بجاے مُسلم ۔ محافہ بجاے مَحَفّہ غلطی بجاے غلط زیادتی بجاے زیادت سلامتی بجاے سلامت ہادیہ بجاے ہَدِیّہ مُغیلان بجاے اُمّ غیلان محابا و مدارا وغیرہ بجاے محابات و مدارات وغیرہ کے علی ہذا القیاس فارسی کے الفاظ بھی اکثر اردو میں غلط بولے جاتے ہیں ۔ اہل ایران عربی کے صدہا لفظ

غلط تلفظ کے ساتھ یا غلط معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً صُــنم و نُجم بجاے صنم و نجم حُوَر بجاے حُوَرا۔ اَبدال بجاے بَدِیل۔ فضولی بجاے فضول حضوری بجاے حضور۔ قُران بجاے قرآن۔ مَشّاطہ بجاے مَشّاطہ۔ مواسا و مفاجا وغیرہ بجاے مواسات و مفاجات وغیرہ انگریزی میں تمام دنیا کی زبانوں سے الفاظ لیے گئے ہیں۔ مگر کسی لفظ کو اُسکی اصلی صورت پر قائم نہیں رکھا مثلاً خلیفہ[1]۔ ترجمان[2]۔ مخزن[3]۔ نواب[4]۔ تعریف[5]۔ قطن[6] امیر البحر[7] عثمان[8] فردوس[9] مُنبان[10]۔ سپاہی[11]۔ شغال[12]۔ کاروان[13]۔ شکر[14]۔ قرمزی[15]۔ کی جگہ جو کہ عربی و فارسی زبان کے الفاظ ہیں۔ کیلف[1]۔ ڈریگومین[2] میگزین[3] نباب[4]۔ ٹیرف[5] کاٹن[6]۔ ایڈمرل[7]۔ آٹومن[8]۔ پیریڈائز[9] سنیرٹ[10]۔ سیپوے[11] جیکول[12]۔ کیروَن[13]۔ شُگر[14]۔ کرمسن[15]۔ بولتے اور استعمال کرتے ہیں۔

اسیطرح جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جاکر اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے۔ پس جبکہ مَبہم یا اَیّت یا اَنشا وغیرہ الفاظ ہمارے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہیں تو اُردو نظم و نثر میں اُنکو کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی سے اُردو میں لیے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہوتے ہیں یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں۔ نہیں بلکہ اُنکو اُردو کے الفاظ سمجھنا چاہیئے۔ جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ ایسے لفظوں کو غلط سمجھکر ترک کرنا اور اُن کو اصل کے موافق استعمال کرنے پر مجبور کرنا بعینہٖ ایسی بات ہے کہ لالٹین کے بولنے سے لوگوں کو منع کیا جائے۔ اور لینٹرن بولنے پر مجبور کیا جائے۔ یا گھڑا بولنے سے روکا جائے اور گھٹ بولنے

کی تاکید کیجائے۔

عام غلطی اور عوام کی غلطی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جو غلط الفاظ خاص و عام دونو کی زبان پر جاری ہو جائیں وہ عام غلطی میں داخل ہیں ایسے الفاظ کا بولنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ صحیح کو بولنے سے بہتر ہے۔ ہاں جو غلط الفاظ صرف عوام اور جہلا کی زبان پر جاری ہوں نہ کہ خواص اور پڑھے لکھوں کی زبان پر۔ البتہ ایسے الفاظ کو ترک کرنا واجب ہے جیسے مزاج کو مجاز کہنا۔ مُنکر کو منسکر۔ خالص کو مخالص۔ ناحق کو بے ناحق۔ دروازہ کو دروزہ۔ نسخہ کو نُخسہ وغیرہ وغیرہ۔

انکے سوا بہت سے ایسے الفاظ واجب الترک بتائے ہیں جو شعرائے متقدمین نے عموماً استعمال کیے ہیں اور دہلی کے بعض شعرا اب بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر روزمرہ کی بول چال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آجتک دلی کے خاص و عام برابر بولتے رہے ہیں۔ جیسے تئیں۔ کبھو کسو۔ آنکھے۔ آخرش۔ پہنانا (پہچاننے کی جگہ) بتلانا۔ دکھلانا وغیرہ۔ سدا (بمعنی ہمیشہ) تلک۔ سیتی۔ مت بجائے حرف نفی۔ بن (بمعنی بے یا بغیر) پہ (پر کی جگہ) کیجے۔ دیجے۔ لیجے۔ بجائے کیجئے۔ دیجئے۔ لیجئے۔ مرا ترا۔ میرا اور تیرا کی جگہ۔ پر بمعنی مگر۔ اک بجائے ایک۔ زور بمعنی عجیب یا نہایت۔

یہ الفاظ شاید لکھنؤ میں ترک ہو گئے ہوں۔ یا ہو جائیں۔ لیکن دہلی اور مضافات دہلی میں وہ کم و بیش برابر بولے جاتے ہیں۔ اور زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بولے جائینگے اور اگر بولے نہ جائینگے تو تحریروں میں ضرور مستعمل رہینگے۔ شاید نثر میں بعض الفاظ کی ضرورت نہ پڑے لیکن شعر میں انکی ضرورت ہمیشہ رہیگی (اگرچہ اسمیں کلام ہے کہ شعر کی بھی ضرورت رہیگی یا نہیں)۔

جو صاحب ایسے الفاظ ترک کرنے کی عام ہدایت کرتے ہیں انکی مثال اُن لوگوں کیسی ہے جو آپ تو ملتان میں مقیم ہیں اور کشمیر جانے والونکو اجازت نہیں دیتے کہ جڑاول کا بوجھ اپنے ساتھ باندھکر لے جائیں۔

اس مضمون کے متعلق زیادہ بحث کرنی فضول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جس ضرورت کے لحاظ سے ہم زبان کے دائرہ کو تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر فی الواقع وہ ضرورت پیش آنے والی ہے تو یہ قیدیں خود بخود اُٹھتی چلی جائینگی اور لوگوں کو بجاے اسکے کہ اپنی زبان کو تنگ اور محدود کریں مجبور دوسری زبانوں سے دریوزہ گری کرنی پڑے گی۔ اور اگر اردو لٹریچر کی ترقی کا خیال ایسا ہی دور از کار خیال ہے جیسا مسلمانوں کی علمی تمدنی۔ اور اخلاقی ترقیات کا۔ تو یہ بحث پیش از وقت نہیں بلکہ ناوقت ہوگی۔

فکر شعر کی طرف کس حالت میں متوجہ ہونا چاہئے

چوتھی بات یہ ہے کہ فکر شعر کیطرف کسحالت میں متوجہ ہونا چاہیئے۔ بعضوں کی یہ راے ہے کہ رات کو سونے سے پہلے اور دن کو طعام چاشت سے پہلے شعر میں طبیعت زیادہ راہ دیتی ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "وحشی مضامین کی رام کرنیوالی کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ جیسا آب رواں اور تنہائی اور بلند نشیمن" لیکن ہمارے نزدیک فکر شعر کے لیے کوئی موقع اور محل اس سے بہتر نہیں کہ کسی مضمون کا جوش شاعر کے دل میں خود بخود پیدا ہو۔ پھر اُسکے لیئے باغ اور جنگل۔ آبادی اور ویرانی۔ سبزہ زار اور چٹیل میدان۔ آب رواں اور چٹپڑ زمیں سب برابر ہے **ابو نواس** جب تک کہ پھولوں کے گلدستہ اُسکے سامنے نہ رکھے جاتے تھے۔ شعر کی فکر نہیں کرتا تھا۔ **ابو العتاہیہ** نے ایک روز اُس سے پوچھا کہ کیا آپ کو بغیر اسکے مضمون نہیں سوجھتا

میں تو بیت الخلا میں شعر کہا کرتا ہوں **ابونواس** نے کہا اسی لیئے تو اُسمیں سے بد بو آتی ہی "۔ لیکن ہمارے نزدیک فکر شعر کے لیئے نہ گلدستوں کی ضرورت ہی اور نہ بیت الخلا میں بیٹھنے کی۔ بلکہ صرف جوش اور ولولہ کی ضرورت ہی جو کسی قید اور شرط کا محتاج نہیں ہے۔ **کُثیّر**[8] سے لوگوں نے پوچھا کہ تو نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا۔ کہا "جوانی جس سے اُمنگ دل میں پیدا ہوتی تھی گذر گئی۔ **عزّہ** جو دل کو گرماتی تھی مرگئی۔ اور **عبدالعزیز** جس سے صلہ کی توقع تھی وہ بھی نہ رہا۔ اب کونسی چیز باقی ہے جو شعر کہوائے"۔ گویا اُسنے اس بات کا اشارہ کیا ہے۔ کہ جب تک دلمیں کسی قسم کا جوش اور ولولہ نہو اُسوقت تک شعر سرانجام نہیں ہو سکتا **فرزدق** کہا کرتا تھا کہ "میں یاس و نومیدی کیحالت میں اَشْعَرُالنَّاس ہوں لیکن بعض اوقات میرا یہ حال ہوتا ہے کہ دانت کو مسوڑے سے اکھیڑنا مجھکو زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت شعر کہنے کے "۔ یعنی بغیر اقتضائے طبیعی اور دلی جوش کے شعر سرانجام نہیں ہو سکتا **خریمی** شاعر سے پوچھا گیا کہ کیا سبب ہے تیرے مدحیہ قصیدے جو **محمد بن منصور** کی شان میں اُسکی زندگی میں تو نے لکھے تھے بہ نسبت مرثیوں کے جو اَب تو اُسکی نسبت لکھتا ہے زیادہ عمدہ ہیں؟ اُسنے تسلیم کیا اور نہایت ایمانداری سے جواب دیا کہ "ہماری امیدیں اور خواہشیں زیادہ قوی اور پُرزور ہیں بہ نسبت ہماری وفاداری اور حق گذاری کے قصیدے ہمسے امید لکھواتی تھی اور مرثیئے وفاداری لکھواتی ہے۔ اسلیئے دونو میں فرق بیّن نظر آتا ہے "۔ غرضکہ جب تک دلمیں کسی بات کی چیٹک نہو قوت متخیّلہ مضامین کے القا کرنے میں فیاضی نہیں کرتی۔ مگر جوش شاعر

---

8 کُثیّر ایک مشہور عرب کا شاعر ہو جسکی معشوقہ کا نام عزّہ تھا۔ اور عبدالعزیز بن مروان اُسکا ممدوح تھا۔ جہاں کُثیّر عزّہ لکھتے ہیں وہاں اسی سے مراد ہوتی ہی ۱۲

کے کلام میں جبھی تک باقی رہ سکتا ہے کہ کوئی شے اُسکی آزادی کی مزاحم نہو یا اُسکی آزاد طبیعت کسی خوف اور روک ٹوک کی کچھ پروا نکرے۔ ورنہ ممکن ہی کہ جس مضمون کا جوش فی الواقع اُسکی طبیعت میں موجود ہے اُسکو وہ عمدگی اور خوبی کے ساتھ ادا نہ کر سکے۔

آزادی کی مزاحمت کئی طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی شاعر کو کسی کا خوف اپنے خیالات آزادانہ ظاہر کرنیسے مانع ہوتا ہے۔ چنانچہ **کُثَیّر عزّہ** اور **کُمَیت** بن زید جو نہایت سچے شیعی تھے اُنکی نسبت کہا گیا ہے کہ جو کچھ اُنھوں نے بنی ہاشم کی مدح میں کہا ہے وہ شاعری کے لحاظ سے اُس درجہ کا نہیں ہے جیسے بنی اُمیّہ کی مدح کے قصیدے۔ لیکن ایسی مزاحمت آزادیٔ طبع شاعر کے جوش کو بعض اوقات اور زیادہ اُبھار دیتی ہے **جعفر** برمکی کے مرثیے لکھنے پر لوگ قتل تک کئے گئے۔ باانیہمہ بعضوں نے اُسکے مرثیے ایسے جوش وخروش کے ساتھ لکھے ہیں کہ آج تک یادگار ہیں۔

کبھی سوسائٹی کا دباؤ۔ یا لالچ اور طمع یا اور کوئی ترغیب اُسکی طبیعت کے بہاؤ کا رُخ سیدھے رستے سے دوسری طرف پھیر دیتی ہے۔ یہ اُفتاد ہمارے اکثر شاعروں پر پڑی ہے اور اسنے بہت سے ہونہار اور روشن طبع شاعروں کو ہزّال و فحّاش و مسخرہ تک بنا دیا ہے۔

کبھی شاعر کے پیچھے ایک کد ایسی لگ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُسکو مجبور کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً ہر تقریب یا تہوار پر تہنیت کا قصیدہ لکھنا۔ یا ہر ہفتہ یا عشرہ میں مشاعرہ کیطرح پر غزل سر انجام کرنی۔ گو بظاہر اسمیں آزادی کی کچھ مزاحمت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن انسان کی نیچر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ایسی کدیں اُسکی چلتی گاڑی میں

روڑا اٹکا دیتی ہیں۔ وہ جسطرح ممنوعات پر بالطبع حریص ہے اسیطرح تکلیفات سے بالطبع ابا کرنے والا ہے۔ **انشاء اللہ خاں** جب تک مطلق العنان رہے **سعادت علیخاں** کے دربار میں نت نئے شگوفے اور چٹکلے چھوڑتے اور بات بات پر لطیفے انشا کرتے تھے۔ لیکن جب سعادت علی خاں نے یہ قید لگادی کہ ہر روز دو ایسی نئی باتیں بیان کر دیا کرو جو کبھی نہ سُنی ہوں پھر وہی انشاء اللہ خاں تھے کہ پاگلوں کیطرح گلی کوچوں میں لڑکوں سے پوچھتے پھرا کرتے تھے کہ بھئے کوئی نئی بات بتاؤ۔ آخر اسی جستجو میں قطعی پاگل ہوگئے۔ یوروپ کے ایک زبردست شاعر کا حال سُنا ہے کہ جب اُس نے اپنی آیندہ تصنیفات کا کاپی رائٹ کسی پبلشر کے ہاتھ فروخت کردیا تو وہ کہا کرتا تھا کہ اس معاہدہ سے میری طبیعت بند ہوئی جاتی ہے۔ جب کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں ساتھ ہی یہ خیال گذرتا ہے کہ اب ہم جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل کی اپچ سے نہیں بلکہ اپنا معاہدہ پورا کرنے کو لکھتے ہیں۔ اس خیال سے طبیعت خودبخود دبتی جاتی ہے۔

بہرحال جہاں تک ممکن ہو کسی مضمون کے لکھنے پر اُسوقت تک قلم اُٹھانی نہیں چاہیئے۔ جب تک اُسکی چیٹک دل کو نہ لگی ہو۔ کسی کی ریس سے۔ کسی کی فرمایش سے۔ کسی کے دباؤ سے۔ یا کسی اور مجبوری کے سبب۔ بغیر اقتضائے طبیعی اور ولولہ باطنی کے جو شعر کہا جائیگا۔ یا جو نظم سرانجام کی جائے گی۔ اُسمیں اثر اور زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے۔

غزل قصیدہ مثنوی

پانچویں اصناف سخن میں سے تین ضروری صنفیں جنکا ہماری شاعری میں زیادہ رواج ہے یعنی غزل۔ قصیدہ اور مثنوی اُنکے متعلق چند مشورے دیئے جاتے ہیں۔ سب سے اول ہم **غزل** کا ذکر کرتے ہیں اور ایک خاص مناسبت کی وجہ سے **رُباعی** اور **قطعہ** کو

[illegible]

غزل کی ذیل میں داخل کرتے ہیں۔

غزل غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الا ماشاء اللہ بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل ٭ سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لیے ہوئی تھی مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں کثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زماننا نہایت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ شاعر کو مبسوط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں ملسکتا اور اُسکی قوت متخیلہ بیکار بھی نہیں رہ سکتی۔ اسلیے بسیط خیالات جو وقتاً بعد وقتٍ شاعر کے ذہن میں فی الواقع گذرتے ہیں۔ یا تازہ کیفیات جنسے اُسکا دل روزمرہ کسی واقعہ کو سنکر یا کسی حالت کو دیکھکر سچ مچ متکیف ہوتا ہے۔ اُنکے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رُباعی یا قطعے سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل۔ یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوسکتے اُنکو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اور چند بسیط خیالات جو ایک

٭ غزل کے معنی لغت میں عشقبازی کرنے اور عورتوں سے مخاطب ہونے کے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں زَیْدٌ اَغْزَلُ مِنْ عَمْرٍو۔ یعنی زید عشق کے مضامین عمرو سے بہتر باندھتا ہے۔ یا زید عمرو سے زیادہ عشقباز ہے ۱۲

دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ غزل کے سلسلہ میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسیقدر ہلکی کردیجائیں منسلک ہوسکتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کرینگے۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اُسکا چٹخارا رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں۔ وجد و سماع کی مجلسوں میں۔ لہو و لعب کی صحبتوں میں تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اُسکے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہوسکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہوسکتا کیونکہ اُسمیں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلہ بیان منقطع ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اسقدر دائر و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو اُسکا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جسقدر ہو تھوڑا ہے۔ اسی لیئے ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ لیکن غزل کی اصلاح جسقدر ضروری ہے اُسیقدر دشوار بھی ہے غزل میں جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اُسکا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان ٹپے ٹھمری سے مانوس ہوجاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اُٹھا سکتے۔ داستان سُننے والوں کی پیاس

تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی۔ بوالہوسی اور کامجوئی کی باتوں میں جو مزا ہے وہ خالص عشق ومحبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اوباش والواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارا ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے۔ جن مذاقوں پر ہزل ومطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے اُن پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سرمہ کاجل کنگھی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حُسن ذاتی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ بآواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہو گی یا عمارت خود نہ ہو گی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص وعام بنایا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے سعدی۔ رومی۔ خسرو۔ حافظ۔ عراقی۔ مغربی۔ احمد جام۔ اور جامی وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کیطرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا۔ ہمنے **حیات سعدی** میں کسی موقع بیان کیا ہے کہ انکی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ اُنکے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق ومحبت کے رنگ میں شور بور تھے۔ انکے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جسکو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اُنکی غزل سنکر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ وہ خال وخط کا ذکر اسطرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیا داری مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی وبدنامی ورسوائی کو صوفیوں کی دلق ملمع اور

زاہدوں کی زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے۔ کوئی حماقت غرورِ مال و جاہ سے کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے اور کوئی دُھوکا دُنیا سے بڑھکر نہیں بتاتے۔ انکا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اُنکے دل سے نکلا ہے۔

اِن لوگوں کی غزل گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اُسحالت کے بالکل مناسب تھی جب کہ قوم نے دنیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا اُنکے اشعار اُن لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے جو حُبِّ دنیا اور حُبِّ جاہ میں منہمک۔ خدا سے غافل۔ اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے۔ اُنسے ظالم۔ طمّاع۔ حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریاکار زاہدوں۔ واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو عیّار فقیروں کے دامِ تزویر سے بچاتے تھے۔ وہ اہل اللہ اور ارباب صدق و صفا کو نفس امارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبّہ کرتے تھے۔

اُردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات۔ نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اُردو غزل گویوں کے طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔ ہم بجائے اسکے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقہ پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اُسکی اصلاح کے متعلق اہلِ وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

ا۔ غزل کے لیئے یہ ایک ضروری سی بات قرار پاگئی ہے کہ اُسکی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے

اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دیجائے تو حالتِ موجودہ میں اُسکا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں۔ سرکہ بنجانے کے بعد سرور قائم رہنا لیکن صل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہو۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشق میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی۔ جو غزلیں محض تقلیداً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں اُنمیں اتنا ہی اثر ہوسکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بنکر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دلمیں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اُس کیفیت کا بیان ضرور مؤثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگذشت بیان کرے گا ضرور اُسکے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی۔ لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جسکی حالت خود اُسکی تکذیب کرتی ہے تو اُس سوا اسکے کہ لوگونکو ہنسی آئے۔ اور کوئی اثر مترتب نہیں ہوسکتا۔ پس ایک پارسا نوجوان جسکو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی۔ یا ایک ستر برس کا پیر مرد جسمیں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی اُنکو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھکر بیہودہ اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رُسوا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کامجوئی پر موقوف نہیں ہو۔ بندہ کو خدا کے ساتھ اولاد کو ماں باپ کے ساتھ۔ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ۔ بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ۔ خاوند کو بی بی کے ساتھ۔ بی بی کو خاوند کے ساتھ۔ نوکر کو آقا کے ساتھ۔ رعیت کو بادشاہ کے ساتھ۔ دوستوں کو دوستوں کے ساتھ۔ آدمی کو جانور کے ساتھ۔ مکیں کو مکاں کے ساتھ۔ وطن کیساتھ

ملک کے ساتھ۔ قوم کے ساتھ۔ خاندان کے ساتھ۔ غرضکہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دلبستگی ہوسکتی ہے پس جبکہ عشق و محبت میں اسقدر احاطہ اور جامعیت ہی۔ اور جبکہ عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا پتا بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کردیا جائے اور ایسے سرِ مکتوم کو فاش کرکے اپنی تُنک ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کیجائے۔

اسی لیئے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیئے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں۔ اور جہانتک ہوسکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے۔ مثلاً کلاہ۔ چہرہ۔ دستار۔ جامہ۔ قبا۔ سبزۂ خط مسیں بھیگنا۔ زرگر پسر۔ مطرب پسر۔ مغبچہ۔ ترسابچہ وغیرہ وغیرہ یا محرم۔ کرتی۔ مہندی چوڑیاں۔ چوٹی۔ موباف۔ آرسی۔ جھومر۔ وغیرہ۔

اگرچہ (جیساکہ حیات سعدی کے خاتمہ میں ہمنے مفصل بیان کیا ہے) مرد کا مطلوب ہونا قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہی یہ محض ایک غلط فہمی اور توہمیت کے خیال پر مبنی ہے نہ کہ حقایق و واقعات پر۔ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قبیح اور نالایق دستور ہی جو قومی اخلاق کو داغ لگاتا ہے۔ لہذا اسکو جہانتک جلد ممکن ہو ترک کرنا چاہیئے۔ اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑدینا چاہیئے۔ کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرائے نامور اسی طریقہ پر غزل کہتے چلے آئے ہیں۔ ہر زمانہ کا اقتضا الگ ہوتا ہے۔ جو فحش اور بے حیائی کی

باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے اُستادوں کے کلام میں موجود ہیں۔ اگر ہم آج ویسی باتوں میں اُنکی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھیرتے ہیں پس جہاں ہمنے اُنکی بہت سی خرافات مواخذۂ عدالت کے خوف سے چھوڑی ہیں اُنکی ایک آدہ خرافت محض عقل و اخلاق کے حکم سے بھی چھوڑنی چاہیئے۔

اسیطرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اُسقوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہو۔ کیونکہ اگر معشوقہ کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اُسکے حسن و جمال کی تعریف کرنی اور اُسکے کرشمہ و ناز و انداز کی تصویر کھینچنی گویا اپنے ننگ و ناموس کو اپنوں اور پرایوں سے انٹروڈیوس کرانا ہے اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی نالایقی یا بدنیتی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ اسی بنا پر ایران میں جتنے ممتاز اور برگزیدہ اور اعلےٰ درجہ کے غزل گو گزرے ہیں۔ اُن کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اسقدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں۔ اور اتنی بات ابتک ہندوستان میں بھی موجود ہی کہ گو غزل میں مطلوب کبھی مرد کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے ہیں۔ اور کبھی مرد کی اور کبھی عورت کی خصوصیات بھی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن کبھی مطلوب کے لیئے افعال یا صفات مؤنث نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ مذکر لاتے ہیں۔ مثلاً یوں کبھی نہیں کہتے کہ۔ وہ روزنِ دیوار سے جھانکتی تھی۔ یا وہ پری ہمارا دل لے گئی۔ یا وہ آرسی میں مونہ دیکھتی تھی۔ یا وہ بالے پہن رہی تھی۔ یا وہ اپنی صورت کی متوالی ہے۔ یا وہ عاشق کا دل جلانے والی ہے بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال و صفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں۔ حالانکہ مقام تانیث

کا مقتضی ہوتا ہے۔ مثلاً **ذوق** کہتے ہیں

"جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو اُسی روزن میں گھر زنبور کا"

یا **اما نت** لکھنوی کہتے ہیں۔

"شاعروں میں وہ پری زلف کو وا کیا کرتا
موشگافوں کو گرفتارِ بلا کیا کرتا"

غرضکہ کسی اُردو غزل گو یوں نے معشوق کے لیئے جہاں تک کہ ہمکو معلوم ہے فعل یا صفت مذکر استعمال نہیں کی۔

اگر معشوق کو اطلاق کیحالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت رجال یا نسیا کی غزل میں ذکر نہ کیجائے تو اُسصورت میں افعال و صفات کا مذکر لانا بالکل قاعدہ کے موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوع انسان میں ذکور و اناث دونو داخل ہیں۔ مگر اُس حکم کا موضوع ہمیشہ فردِ کامل یعنی مذکر قرار دیا جاتا ہے نہ مؤنث۔ مذہب میں۔ فلسفہ میں۔ طب میں۔ اخلاق میں اور تمام علوم و فنون میں یہی قاعدہ عموماً جاری ہے۔ لیکن معشوق کو کبھی چہرہ یا قبا یا سبزہ خط کے ساتھ اور کبھی چوٹی موباف آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اسکے افعال و صفات کو ہمیشہ مذکر لانا اسکے یہ معنی ہوں گے۔ کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت۔ بلکہ زنانہ ہے یا ہیجڑا۔

ایسے اشعار جنمیں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر

حاوی ہوں یا محض عشق روحانی یا عشق الٰہی پر محمول ہو سکیں اور جنسے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جائے۔ کیا فارسی اور کیا اردو دونو زبانوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں خصوصاً شعرائے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں پس غزل میں ہمیشہ کے لیے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہے جسکو تکلیف مالایطاق سمجھا جائے

۲- جسطرح عشقیہ مضامین غزل کے نیچر میں داخل ہیں اسیطرح خمریات یعنی شراب اور اسکے لوازمات کا ذکر اور نیز فقہا و زہاد اور تمام اہل ظاہر پر طعن و تعریض کرنی اپنی میخواری و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقوی کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں۔ یہ مضامین بھی غزل کے اجزائے غیر منفک قرار پا گئے ہیں سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحب باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدی و رومی و حافظ و خسرو وغیرہم چونکہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسن قبول پایا اور خاصکر خواجہ حافظ کی غزل جسمیں ان مضامین کی بہتات سب سے بڑھکر ہے حد سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ اسلیئے متاخرین نے بھی انکی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کر لیا مگر ہمکو دیکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھنے میں اسقدر غلو کیا ہے۔ اس کا منشا کیا تھا۔

فقہا اور اہل ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہل باطن کے

دوسرے اہل رائے کے۔ فقہا کے فتووں سے ان دو نوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں قتل کیے گئے ہیں۔ دار پر چڑھائے گئے ہیں مشکیں بندھی ہیں۔ کوڑے کھائے ہیں۔ قیدیں بھگتی ہیں۔ جلاوطن کیے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں اور اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جبکہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے۔ بقول شخصے "کہ یکا ہاتھ چلے کسی کی زبان" فقہا و واعظین انکے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے۔ انھوں نے انکے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا شراب خوری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھکر کوئی گناہ نہیں وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا تم حقوق عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہل ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اسکے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام و صراحی اور انکے لوازمات اور خلاف شرع الفاظ مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں یہ لوگ یا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہو۔ یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسن ظن

جو رہزن طریقت ہی اُس سے محفوظ رہیں۔ یا اسلیئے کہ عشق و محبت کی بھڑاس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مؤدب گفتگو کے خوب نکلتی ہے۔ اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں۔ اور اُن کی زجر و ملامت جو بے گناہ ملزموں کو تحسین و آفرین سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے مزے لے لے کر سنیں) روحانی کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ سب سے اخیر درجہ کا ثبوت مولٰنا روم کی اس رباعی سے ہوتا ہے۔

دی بر سر کوی زلہ غارت کردم مرپاکاں راجاذب زیارت کردم
شکرانہ آنکہ روزہ خوردم رمضاں درعید نماز بے طہارت کردم

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رمضان میں روزے کھانے کے یہ معنی ہیں کہ جب مجاہدہ سے مشاہدہ تک نوبت پہنچگئی تو ریاضت ترک کردی گئی۔ اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید میسر آگئی اور جدائی کا الم جاتا رہا۔ اب حضوری بے کیف جو کہ حقیقتِ صلوۃ ہے ہر وقت رہنے لگی۔ یہانتک کہ ظاہری طہارت اور عدم طہارت اور جاگتے اور سوتے غرضکہ ہر حالت میں دولت حضوری سے عوض ہے خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرع میں **خطا پوش** کے لفظ سے قلم صنع کی خطاپوشی کا خیال ذہن میں گذرتا ہے۔ مگر فی الحقیقۃ یہ مطلب نہیں ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے

کیونکہ قلمِ صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اُسنے لکھدیا ہے وہ اٹل ہے اور اس سے انسان کا مجبور ہونا اور اسلیئے اُسکا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جنسے اہل ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے۔ اسی لیئے مولنا روم فرماتے ہیں

"خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

ان بزرگوں کے سوا بعضے شعرا ایسے بھی گزرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور نشہ یا خمار کیحالت میں جو کیفیت اُنکے دلپر گزرتی تھی یا جو اثر اُنکی طبیعت یا اخلاق پر ہوتا تھا اُسکو شعر میں بیان کرتے تھے۔ چونکہ شاعری کا جزوِ اعظم (جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے) یہ ہے کہ اُسمیں جو خیال باندھا جائے اُسکی بُنیاد اصلیّت پر ہونی چاہیئے اسلیئے اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف اُن لوگوں کا حق ہونا چاہیئے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کرسکتے ہوں نہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائینگے جیسا بندر انسان کا ہوتا ہے۔ نیز واعظ و زاہد وغیرہ کو تاڑنا اور اُنپر نکتہ چینی کرنی انھیں لوگوں کو زیبا ہے۔ جنکو فی الواقع اُن کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ ہاں باوجود نہونے کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جاسکتے ہیں یعنی نکتہ چینی ایسے طریقہ سے کیجائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی بُرائی بیان کرنی مقصود ہے نہ کہ زُہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا کیونکہ رذائل کی

برائی اور فضائل کی خوبی بغیر اسکے دلنشین نہیں کیجاسکتی کہ کسی شخص یا گروہ کو انکا موضوع فرض کرلیا جائے اور معقولات کو محسوسات کے پیرایہ میں ظاہر کیا جائے ظلم اور عدل کا بیان واضح طور پر اسیطرح ہوسکتاہے کہ ظالم یا منصف بادشاہ کی مذمت یا تعریف کیجائے۔ اور نامردی یا بہادری کی تصویر یونھیں دکھائی جاسکتی ہے کہ انکو کسی بزدل یا بہادر کے قالب میں ڈھالا جائے لیکن اسصورت میں ضرور ہے کہ واعظ و زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کیطرف جو عقلاً یا شرعاً قابل الزام ہو کچھ اشارہ کیا جائے ورنہ کہا جائے گا کہ نیکوں پر نہ اسلیئے کہ وہ قابل الزام ہیں۔ بلکہ اسلیئے کہ وہ نیک ہیں حملہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بطور مثال کے ہم شیخ ابراہیم **ذوق** کے دو شعر لکھتے ہیں۔

زیدِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسیقدر اُس خصلت کیطرف اشارہ پایا جاتاہے جو اکثر زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہوکر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں۔ لہذا اس طرز بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا مگر دوسری جگہہ وہ اسطرح فرماتے ہیں۔

ذوق زیبا ہے جو ہو ریشِ سفیدِ شیخ پر وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے

اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اسکے کہ شیخ ہے نہیں جتلایا گیا اور شعر میں اسکے سوا اور کوئی خوبی نہیں رکھی گئی کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہکر بھنگڑوں اور شرابیوں کی ضیافت طبع کیجائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کو

اگر ہم اپنے شعرا کا حد سے زیادہ ادب کریں تو **سعدی** اور **سوزنی** کی ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

۳۔ مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دلمیں اُٹھے۔ خواہ اُسکا منشا خوشی ہو یا غم۔ یا حسرت۔ یا ندامت۔ یا شکر۔ یا شکایت۔ یا صبر۔ یا رضا۔ یا قناعت یا توکل۔ یا رغبت۔ یا نفرت۔ یا رحم۔ یا انصاف۔ یا غصہ۔ یا تعجب۔ یا امید۔ یا ناامیدی یا شوق۔ یا انتظار۔ یا حُبِّ وطن۔ یا قومی ہمدردی۔ یا رجوع الی اللہ۔ یا حمایت دین و مذہب یا دنیا کی بے ثباتی۔ او موت کا خیال۔ یا اور کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے۔ اُسکو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اُسکو ہر مضمون کے لیئے عام کر دیا ہے۔ اور اب اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں۔ وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیئے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے ہیں اور اُنھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہمکو چاہیئے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا ارگن بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لیئے ہاتھ پانو مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو۔ لیکن ہمارے دلمیں اس خیال کی حقارت ہو۔ یا اُنھوں نے اسکے برعکس ہاتھ پانو توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل میں

اسکے برخلاف حالت طاری ہو۔ دونو صورتوں میں ہمارے مونہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے
جو ہمارے دلسے اُٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گذرے کہ مثلاً کوشش
و تدبیر ہمکو محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو۔ اور دوسرے وقت ہمارے ہی دلمیں ایسا جوش پیدا
ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں ہمکو دونو حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے
کم و کاست کھینچدینی چاہیئے۔ اِس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور جو
انقلاب کہ اُسکی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں وہی منکشف ہونگے۔ بلکہ قومی اخلاق
پر بھی عمدہ اثر ہوگا کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور بُرا دونو پہلو نہ دکھائے جائیں تب تک
اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً **صائب** ایک جگہ کہتے ہیں۔

قناعت کن بہ نانِ خشک تا بے آرزو گردی — کہ خواہش ہاے الوان ست نعمت ہاے الوان را

دوسری جگہ یہی **صائب** کہتے ہیں۔

صرف بیکاری مگردان روزگار خویش را — پردہ روی توکّل ساز کار خویش را

ظاہر ہے کہ جبتک دونو مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو تن آسانی
اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسیکو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ
مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے
بیان میں ہے وہ وعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر
پیرایہ میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اور بلاشبہ غزل جسمیں سوز و گداز نہو اور بچہ جو چلبلا

اور چونچال نہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی لیکن ہمارے معاصرین کے لیئے سوز وگداز کا اسقدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک ختم نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہورہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آجکل دنیا کا حال صاف اُس درخت کا سا نظر آتا ہے جسمیں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پُرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو اُنکے گرد وپیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پُرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں اُنکی جگہ لیتی جاتی ہیں۔ اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہی جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کرکے رہجائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرہ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اُسکی جزئیات کے بیان کرنیکے لیئے کافی نہیں ہوسکتی کسی واقعہ کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا۔! کسی کو دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا۔ اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں اس سے زیادہ دلچسپ میٹریل غزل کے لیئے اور کیا ہوسکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق وعاشقی کی ترنگیں اقبالمندی کے زمانہ میں زیبا تھیں اب وہ وقت گیا عیش وعشرت کی رات گذر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا اب جوگئے کی الاپ کا وقت ہی۔

اسکے سوا بڑے بڑے اُستادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جنمیں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہی بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک

ایک ہی۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو انہیں کسیقدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت صبح اور شام کا سماں چاندنی رات کا لطف جنگل یا باغ کی بہار میلے تماشوں کی چہل پہل قبرستان کا سناٹا۔ سفر کی روداد۔ وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزلیں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہانتک ممکن ہو وسعت دینی چاہیئے شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے انسان کو اگر ہمیشہ طرح بطرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے۔ لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلوّن اور تنوّع نہ ہو اُس سے جی اکتا جاتا ہے جو گویا صبح شام رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے اُسکا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسیطرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے۔

" مکرر گرچہ سحر آمیز باشد طبیعت را ملال انگیز باشد "

اگرچہ اسمیں شک نہیں کہ جسطرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے۔ اسیطرح ایک ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے۔ لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئے نئے صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ تو اسمیں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں اُس مضمون میں تنوّع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اُسیکو چھیڑے چلے جائینگے تو بجائے تنوّع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگیگا۔ بھروپیا

دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہہ میں ڈال سکتا ہے۔ مگر پھر اُسکی قلعی کھلجاتی ہے۔ ہر کوئی اُسکو دور ہی سے دیکھکر پہچان لیتا ہے کہ بہروپیا ہے۔ ہم لوگ جب غزل لکھکر مشاعرہ میں جاتے ہیں تو اپنے دلمیں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اور اچھوتے مضمون باندھکر لے چلے ہیں۔ مگر غزل کو دیکھیے تو وہی انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد سانچے تیار ہیں کوئی مدوّر ہے۔ کوئی مستطیل۔ کوئی مثلث کوئی مربع۔ کوئی مسدس اور کوئی مثمن۔ اب ہر ایک سانچے میں موم کو پگھلا کر ڈالو ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم نئی شکل پر ڈھلکر نکلیگا۔ بعینہ ایسا ہی حال غزل کا ہے۔ مضمون وہی معمولی ہیں۔ مگر بحر اور ردیف و قافیہ کے اختلاف سے مختلف شکلیں پیدا کر لیتے ہیں۔

ایک مشہور شاعر کا دیوان غزلیات اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اُس میں **چاک گریباں** کا مضمون مفصلۂ ذیل صورتوں میں بندھا ہوا ہے۔

۱۔ اے جنوں گریبان تو چاک کر چکے۔ اب کیا کریں کوئی اور شغل بتا۔

۲۔ لوگ پھر جامہ دری کرنے لگے۔ اور ہمارا ہاتھ پھر گریبان تک جانے لگا۔

۳۔ بہار کے دن قریب آگئے جو گریبان خود بخود پھٹا جاتا ہے۔

۴۔ اگر بہار میں میری پوشاک نہ چھین لیجاتی تو بدن پر نہ دامن نظر آتا نہ گریبان۔

۵۔ اگر عقل کی پابندی نہوتی تو ہم دامن اور گریبان سب پھاڑ ڈالتے۔

۶۔ وہ ہاتھ چھوڑا کر چلا گیا میں بھی اب گریبان کو پھاڑ کر چھوڑونگا۔

۷۔ اے جنوں ہم جدائی میں گریبان پھاڑتے ہیں تو ساری رات اُس کے تار گنتا رہ۔

۸۔ اُسکی تحریر سے میں ایسا دیوانہ ہوا کہ پیراہن چاک کر ڈالا۔

۹۔ اُسکی چست قبا کا دامن دیکھکر گریبان پھٹتے ہیں۔

۱۰۔ اے جنوں دامن کیطرح گریبان کے بھی لتے لے۔

۱۱۔ دیکھئے ہم کب تک کپڑے پھاڑتے ہیں اور کبتک ہمکو جنوں سوزن کیطرح عُریاں رکھتا ہے۔

۱۲۔ اے جنوں اب جامہ دری مت کر ہم دامن کو پھاڑ کر کبتک گریبان میں رفو کرتے رہیں۔

۱۳۔ بہار میں ہاتھ کیسے بیکار رہیں آؤ گریبان ہی چاک کریں۔

۱۴۔ اے جنوں گریبان مجھکو پھانسی سے بھی زیادہ تنگ کرتا ہے۔ اُسکی دھجیاں اُڑا دے۔

۱۵۔ اے جنوں اب کے سال بہار میں گریبان کو ایسا چاک کر کہ کسی سے رفو نہو سکے۔

۱۶۔ تم تو ہاتھ سے دامن چھڑا کے نکلگئے ہم اپنا گریبان چاک کر کے نکلگئے۔

۱۷۔ جنوں جو حد سے بڑھا تو گریبان چاک ہو کے دامن سے نکل گئے۔

۱۸۔ مجھے چاک گریبانوں پر حسرت آتی ہے کہ کیسے دامنِ صحرا کی طرف دوڑے جاتے ہیں

۱۹۔ ہمارے ہاتھ جنون کی بدولت زوروں پر ہیں کہ نئے نئے گریبان چاک ہوتے ہیں۔

۲۰۔ اے جنوں تیرے ہاتھوں سے کتنا تنگ ہوں روز نئے گریبان کہاں سے لاؤں۔

۲۱۔ اُسکے عاشق ہمیشہ گریبان چاک رکھتے ہیں۔ گل کے گریبان میں کہیں بھی رفو ہے؟

۲۲۔ بہار آئی اور جنوں پھر کپڑے پھاڑنے لگا کتنے ہی گریبان چیتھڑے ہو ہو کر اُڑ گئے

۲۳۔ اے جنوں تجھکو سودائے زلف کی قسم ہے جو گریبان کا ایک تار بھی بیکار جانے دے

جس دیوان سے ہمنے یہ ایک مضمون کے ۲۳ اسلوب بیان نقل کیئے ہیں یہ کچھ اوپر دو سو صفحہ کا دیوان ہے۔ جب ایک مختصر دیوان کا یہ حال ہے تو اُردو کے تمام دیوانوں میں دیکھنا چاہیئے کہ یہی ایک مضمون کتنی شکلوں میں باندھا گیا ہوگا۔ اور اگر فارسی کے دواوین کو بھی اُنمیں شامل کر لیا جائے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اسی ایک مضمون کے اشعار سے کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ حالانکہ مضمون ایسا تنگ ہے کہ اُسمیں ایک دو اسلوب سے زیادہ گنجایش نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ غزل کے وہ معمولی مضامین جنمیں اس مضمون کی نسبت زیادہ پہلو نکل سکتے ہیں۔ اُنکی کہاں تک نوبت پہنچی ہوگی۔ جیسے جفائے یار۔ رشکِ اغیار۔ شوقِ وصل۔ رنجِ فراق۔ زلفِ پریشان۔ چشمِ فتّان۔ بُت پرستی۔ توبہ شکنی رندی و بادہ خواری وغیرہ وغیرہ۔ اسمیں بالکل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا۔ کہ اگر تمام فارسی و اُردو کی غزلیات کا خلاصہ کیا جائے اور مکرّرات کو چھوڑ کر محض اصلی مضامین چھانٹے جائیں تو سو سوا سو صفحہ سے زیادہ کل مضامین کی مقدار نہ نکلے گی۔ اور اگر یہ التزام کیا جائے کہ ہر ایک مضمون جتنے عمدہ پہلوؤں سے باندھا گیا ہو اُن سب کو انتخاب کر لیا جائے تو بیشک اس سے کسیقدر مقدار بڑھجائے گی۔ مگر اکثر عمدہ پہلو قدما کے کلام میں نکلیں گے۔ اور اُنکے فضلات متاخرین کے کلام میں۔ یہی چاک گریباں کا مضمون جو متاخرین میں سے ایک نے ۲۳ طرح پر باندھا ہے **میر تقی** کے ہاں اسطرح بندھا ہوا ہے۔

"اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں"

مجھکو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر **چاک گریباں** کا مضمون باندھا ہو۔

مذکورۂ بالا تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ متاخرین قدما کے کلام سے کوئی بات اخذ نکریں اور جو مضمون وہ باندھ گئے ہیں اب اُسکو کسی پہلو سے نہ باندھیں۔ یا اپنے باندھے ہوئے مضامین کا پھر اعادہ نکریں کیونکہ بغیر اسکے نہ صرف شعر میں بلکہ ہر فن اور ہر صناعت میں کسیطرح کام نہیں چل سکتا **کعب** ابن زہیر جو ایک مُخضرمی شاعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدّاح ہے وہ کہتا ہے۔

"مَا اَرَانَا نَقُوْلُ اِلَّا مُعَارًا اَوْ مُعَادًا مِنْ قَوْلِنَا مَکْرُوْرًا"

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اوروں کے کلام سے مستعار لیکر کہتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو بار بار دوہراتے ہیں) پس جب کہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے شعرا کا ایسا خیال تھا تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی خوشہ چینی سے ہمکو استغنا حاصل ہے یا ہمکو یہ قدرت ہے کہ کوئی مضمون ایک دفعہ باندھکر پھر اُسکا اعادہ نکریں۔

عربی میں دو متناقض مثلیں مشہور ہیں ایک یہ ہے کہ "کَمْ تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ" (یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیئے چھوڑ گئے ہیں) اور دوسری یہ مثل ہے کہ "مَا تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ شَیْئًا" (یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لیئے کچھ نہیں چھوڑا) ان دونو مثلوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ اگلے بہت سی ادھوری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے اُنکو پورا کریں لیکن اُنھوں نے پچھلوں کے لیئے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جسکا نمونہ موجود نہ ہو

اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کرکے اُسمیں کوئی ایسا لطیف اضافہ یا تبدیلی کرے جس سے اُسکی خوبی یا متانت یا وضاحت زیادہ ہو جائے وہ درحقیقت اُس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں۔

"از ورطۂ ما خبر ندارد آسودہ کہ بر کنارِ دریاست"

اسی مضمون کو خواجہ حافظ نے اسطرح ادا کیا ہے۔

"شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں ہائل کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا"

ظاہر ہے کہ حافظ نے اس مضمون میں گویا اُس کمی کو پورا کردیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ حافظ نے شیخ سے یہ مضمون چھین لیا۔ اسی مطلب کو نظیری نے یوں تعبیر کیا ہے۔

"بہ زیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را نواگرانِ نخوردہ گزند راچہ خبر"

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جسکے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ حافظ سے مضمون چھین لیا۔ لیکن اُسنے مضمون کو ایسے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک روز خواجہ حافظ کا یہی شعر ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے تھے یہ شعر سُنکر بولے۔ "کاش دوسرے مصرع میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور اسباب کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا تاکہ بیدردو

ہمارے حال کی کیا خبر ہے۔ تاکہ اپنے حال میں مبتلا ہونے اور غیر کے تصور سے ذہول ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا " میں نے **غالب** مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست"

وہ یہ شعر سنکر پھڑک گئے اور کہا کہ ہاں بس میرا یہی مطلب تھا۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہجاتی ہے جسکو پچھلے پورا کر دیتے ہیں۔ کبھی قدما ایک مضمون کو کسی خاص اسلوب میں محدود سمجھ لیتے ہیں متاخرین اُسکے لیئے ایک نرالا اسلوب پیدا کر دیتے ہیں۔ اور کبھی متاخرین قدما کے اسلوب میں سے ایک خوبی کم کر کے ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پس کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تخیل پر بھروسا کر کے قدما کی خوشہ چینی سے دست بردار ہو جائے۔

شفائی صفاہانی یا متاخرین شعرائے ایران میں سے کوئی اور شخص غزل میں کہتا ہے۔

"مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید"

قائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پسند کے لیئے معشوق کے معمولی بناؤ سنگار کافی نہیں ہیں پس مشاطہ کو چاہیئے کہ اُنمیں کچھ اور اضافہ کرے کیونکہ اب اُسکے دیکھنے کی نوبت ہم تک پہنچی ہے۔ شاعر نے مضمون میں جدت تو پیدا کی۔ مگر پھسپھسنڈی۔ اول تو اُسنے جسکو دوست قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اُسکی محبت کا نقش اُسکے دلمیں نہیں بیٹھا

پھر اُسکو دوست کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے اُسکے بیان سے ظاہر ہوتا ہے
کہ وہ معشوق کے حُسن ذاتی سے کچھ دلبستگی نہیں رکھتا بلکہ عارضی بناؤ سنگار پر فریفتہ ہے
تیسرے عشق جو ہمیشہ بے قصد و بے ارادہ پیدا ہوتا ہے اُسکو قصد اور ارادہ سے پیدا
کرنا چاہتا ہے

مرزا غالب مدح میں کہتے ہیں

زمانہ عہد میں ہے اُسکی محوِ آرایش　　　بنینگے اور ستارے اب آسماں کیلئے

ظاہرا یہ خیال اسی فارسی شعر سے قصداً یا بلا قصد پیدا ہوا ہے مگر مرزا نے اس مضمون کو
اصل خیال کے باندھنے والے سے بالکل چھین لیا ہے جو خلل تغزل کیحالت میں اُسمیں موجود
تھے وہ مدح کیحالت میں بالکل نہیں رہے **مرزا** نے ممدوح کو ایک ایسے کمال کے ساتھ موصوف
کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کاملتر اور افضلتر حالت میں دیکھنا چاہتا
ہی۔ اسلیئے ہر شئے اپنے تئیں کاملتر حالت میں اُسکو دکھانا چاہتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ
نکلا ہے کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کے لیئے اور ستارے پیدا کیے
جائیں اسپر سوا اسکے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جائے اور کسیطرح کی گرفت نہیں ہو سکتی بخلاف
فارسی شعر کے کہ اُسکی بنا خود اصول شاعری اور آداب عشق و محبت کے برخلاف ہے۔

عرفی شیرازی کہتا ہے۔

"ہر کس نہ شناسندہ راز است وگرنہ　　　اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است"

غالب مرحوم نے اسی مضمون کو دوسرے لباس میں اسطرح جلوہ گر کیا ہے۔

"محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا"

اگرچہ گمان غالب یہ ہے کہ **عرفی** کی رہبری اس خیال کیطرف قرآن مجید کی اس آیت سے ہوئی ہوگی۔ "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ" لیکن ہر حالت میں عرفی کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور جس اسلوب میں کہ یہ خیال اُس سے ادا ہوگیا ہے۔ اب اس سے بہتر اسلوب ہاتھ آنا دشوار ہے۔ بااینہمہ مرزا کی جدت اور تلاش بھی کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے کہ جس مضمون میں مطلق اضافہ کی گنجایش نہ تھی اُسمیں ایسا لطیف اضافہ کیا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی کے لطف معنی سے بھی خالی نہیں ہے **عرفی** کا یہ مطلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں یہی درحقیقت اسرار ہیں **مرزا** یہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں مانع کشف راز معلوم ہوتی ہیں یہی درحقیقت کاشف راز ہیں۔

بہرحال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ متاخرین قدما کے کلام سے کرتے رہے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ شعرائے عرب جب کوئی اچھوتا مضمون باندھتے تھے اور لوگ متعجب ہوکر اُن سے پوچھتے تھے کہ کس تقریب سے یہانتک ذہن پہنچا؟ تو وہ صاف صاف اپنے خیال کا ماخذ بتا دیتے تھے **ابونواس** نے **فضل** بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔ "وَلَیْسَ لِلّٰهِ بِمُسْتَنْکَرٍ * اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ" (یعنی خدا سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تمام عالم کو ایک شخص کی ذات میں جمع کردے) اسپر کسی نے اُس سے پوچھا کہ یہ مضمون کیونکر سوجھا؟ **ابونواس** نے صاف کہدیا کہ یہ خیال **جریر** کے اُس شعر سے پیدا ہوا جو اُسنے **بنی تمیم** کی تعریف میں کہا ہے۔

"اِذَا غَضِبَتْ عَلَيْكَ بَنُوْ تَمِيْمٍ حَسِبْتَ النَّاسَ كُلَّهُمْ غِضَابًا"

(یعنی جب بنی تمیم تجھسے ناراض ہو جائیں تو سمجھنا چاہیئے کہ تمام بنی آدم تجھسے ناراض ہیں)

شعر ہی پر کچھ موقوف نہیں بلکہ تمام علوم و فنون میں انسان نے اسیطرح ترقی کی ہے کہ اگلے جو ادھورے نمونے چھوڑتے گئے پچھلے اُنمیں کچھ کچھ تصرف کرتے رہے یہانتک کہ ہر ایک علم اور ہر ایک فن کمال کے درجہ کو پُہنچ گیا۔ شعر کی ترقی بھی اسیطرح متصور ہے کہ قدما کے خیالات میں کچھ کچھ معقول تصرفات ہوتے رہیں۔ لیکن اس قسم کے تصرفات کرنیکے لیئے شاعر کی پوری لیاقت ہونی چاہیئے۔ ورنہ جیسے ایجادات ہمارے ملک کے اکثر شعرا کرتے ہیں اُنسے بجائے ترقی کے روز بروز شاعری نہایت ذلیل و پست و حقیر ہوتی جاتی ہے۔

فارسی میں کم اور عربی میں زیادہ اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں نظم سے بھی زیادہ ہر قسم کے بلند۔ لطیف اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے پس ہمارے ہموطنوں میں جو لوگ ایسے دماغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کرکے اُنمیں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مبلغ فکر کے موافق تصرف کرکے۔ اور جنکی قوت متخیلہ اُنسے کم درجہ کی ہے وہ اُنھیں خیالات کو بعینہٖ اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ترجمہ کرکے اُردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں سنسکرت اور بھاشا میں خیالات کا ایک دوسرا عالم ہے اور اُردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اسلیئے ان زبانوں سے بھی خیالات کے اخذ کرنے میں کمی نہ کریں اور جہانتک کہ اپنی زبان میں اُنکے ادا کرنے کی طاقت ہو اُنکو شعر کے لباس میں ظاہر کریں۔ اور

اسطرح اردو شاعری میں ترقی کی روح پھونکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعرا نے جو کہیں کہیں فارسی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کر دیا ہے اُنپر لوگوں نے اعتراض کئے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے ایک زبان کے شعر کا عمدہ ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ایک بزرگوار نے سارا اسکندرنامہ بحری اُردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے۔ اور ہمنے سُنا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور مولوی بھی اُنکے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کرے میوہ زیبا جو ہر شاخ کو ۔۔۔ کدیو فرامش کرے خاک کو
ہوا جبکہ آراستہ باغ خوش ۔۔۔ بہر میوۂ شیرین و ہم ترش
بہ شادی لب پستہ خنداں ہوا ۔۔۔ رطب اسپہ بھی تیز دنداں ہوا
ہوا چہرۂ نار افروختہ ۔۔۔ کہوں تاج پر لعل جوں دوختہ
بہ رغبت بہ ہر شاخ انجیر دار ۔۔۔ لٹکنے لگے مُرغ انجیر خوار
اُٹھایا لب خم نے جوش نفیر ۔۔۔ ہم از بوے شیرہ ہم از بوے شیر

شاید اس مترجم کی نسبت تو یہ کہا جا سکے کہ وہ مشاق شاعر نہ تھا اسلیئے عمدہ ترجمہ نہ کر سکا لیکن ہم مشاق شاعروں سے کہتے ہیں کہ از راہ عنایت زیادہ نہیں تو انھیں چھ شعروں کو فصیح اردو نظم میں تو ذرا لکھ دیں۔ جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے گو اس سے اُسکی قوت متخیلہ کا کمال ثابت نہیں ہوتا۔ مگر وہ ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

ہمارے بعض شعرا نے بعضے ایسے خیالات کو جو فارسی اشعار میں تھے اُردو میں ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ من وجہٍ اصل شعر سے بڑھ گئے ہیں **نظیری** کا شعر ہے

"بوی یارِ من ازیں سُست وفا مے آید گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم"

سودا کہتے ہیں

"کیفیتِ چشم اُسکی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

اسمیں شک نہیں کہ **سودا** نے اپنی شعر کی بنیاد **نظیری** کے مضمون پر رکھی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اُسکا ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن بلاغت کے لحاظ سے **سودا** کا شعر **نظیری** سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی ممکن ہے کہ عاشق ازخود رفتہ ہو جائے لیکن ساغر شراب کو دیکھکر معشوق کی نشیلی آنکھ کے تصور سے بیخود ہو جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اسکے سوا "از کار شدم" میں وہ تعمیم نہیں ہی جو اسمیں ہے کہ "چلا میں" نہیں معلوم کہ آپے سے چلا یا دین و دنیا سے چلا یا جگہ سے چلا۔ یا کہاں سے چلا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "چلا میں" ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مدہوش و بدحواس ہو کر گرنے کو ہوتا ہے اور "از کار شدم" میں یہ بات نہیں ہی۔ معطل ہونے۔ معزول ہونے۔ اپاہج اور نکمے ہونے کو بھی "از کار شدن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

لا اعلم

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منی را افسردہ دل افسردہ کند انجمنی را

خواجہ میر درد

نہ کہیں عیش تمھارا ابھی منغّص ہوجائے دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

ممکن ہے کہ خواجہ میر درد نے فارسی شعر سے یہ مضمون اخذ کیا ہو لیکن یقیناً اُنکا شعر فارسی شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اول تو فارسی مطلع کے مضمون کو اپنے مقطع میں لانا جسمیں خود درد کا لفظ ہی شاعر کے دعوے پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ پھر راہ مت دو کی جگہ یاد کرو بولنا جسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ درد کا اپنی محفل میں ذکر نہ کرو دوسرے یاد کرنے کے معنی ہیں اعلیٰ کا ادنےٰ کو اپنے پاس بُلانا۔ اور بڑی خوبی درد کے شعر میں یہ ہی کہ محفل میں نہ بلانے کی وجہ جو فارسی میں یقینی طور پر بیان کی گئی ہے اُسکو میر درد نے احتمال کیصورت میں اسطرح بیان کیا ہے " نہ کہیں عیش تمھارا ابھی منغّص ہوجائے" ان دونو اسلوبوں میں ایسا ہی فرق ہے۔ جیسے ایک شخص تو بیمار سے یوں کہے کہ "بدپرہیزی سے آدمی ہلاک ہوجاتا ہے"۔ اور دوسرا یہ کہے " دیکھو کہیں بدپرہیزی میں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو " دوسرے اسلوب میں جیسا کہ ظاہر ہے بہ نسبت پہلے اسلوب کے زیادہ تخویف و تحذیر ہے۔

سعدی شیرازی

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم بایداول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟

میر تقی

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ اُنسے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے؟

میر کا یہ شعر ظاہرا سعدی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ مگر سعدی کے ہاں **خوب** کا لفظ ہے اور میر کے ہاں **پیارے** کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کہ **خوب** کا محبوب ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے، لیکن **پیارے** کا پیارا ہونا ضرور ہے پس **سعدی** کے سوال کا جواب ہو سکتا ہے مگر **میر** کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترجمہ کرنا بشرطیکہ ترجمہ کے فرائض پورے پورے ادا ہو جائیں کوئی عیب کی بات نہیں ہو سکتی۔ سعدی جو فارسی شاعری کا ہومر ہے خود اُسکے کلام میں عربی اقوال و امثال کے ترجمے یا اُنکا ماحصل موجود ہے۔ مثلاً

سعدی	اقوال عربی
۱۔ سگ بدریائے ہفتگانہ بشوے چونکہ تر شد پلید تر باشد	ع۔ الکلبُ انجسُ مایکونُ اِذا اغتسل
۲۔ ترا خامشی اے خداوند ہوش وقارست و نا اہل را پردہ پوش	الصّمتُ زینةُ العالم و سِتْرُ الجاهل
۳۔ تو بجائے پدر چہ کردی خیر تا ہماں چشم داری از پسرت	دَاعِ اباكَ يُراعِ ابنك
۴۔ شپرہ گر نورِ آفتاب نخواہد رونق بازارِ آفتاب نکاہد	سَناءُ ذُكاءٍ لایزول من دعاء الخفاش
۵۔ نیکبخت آنکہ خورد و کشت و بدبخت آنکہ مرد و ہشت	السعید من اکل و زرع والشقی من مات و ودع

۲- پادشاہاں بخردمنداں محتاج ترانذکہ — السلطان احوج الی العقلاء من العقلاء
خردمنداں بہ پادشاہاں۔ — الی السلطان۔

اہل یوروپ جو آج لٹریچر میں بھی مثل علوم و فنون و صنائع کے تمام دنیا سے فائق ہیں اسکا سبب اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی مشہور قوم ایسی نہیں جسکی شاعری اور انشا کا لب لباب انکی زبانوں میں موجود نہو۔ پس ہمکو بھی چاہیئے کہ جسقوم اور جس زبان کے خیالات ہمکو بہم پہنچیں اُنسے یہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھائیں اور صرف اُنھیں چند فرسودہ اور بوسیدہ خیالات پر جو صدیوں سے برابر بندھتے چلے آتے ہیں قناعت کرکے نہ بیٹھ رہیں کیونکہ علم و ہنر میں قناعت ویسی ہی قابل ملامت ہے جیسی مال و دولت میں حرص۔

۴- جسطرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسیطرح اُسکی زبان بھی ایک خاص دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ چند معمولی مضمون جب صدیوں تک برابر رٹے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ اُنکے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سُننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُن الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو اُنھیں کے ہم معنی ہوں استعمال کیئے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

عشقیہ مضامین ہمارے ہاں کچھ غزل ہی کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے۔ بلکہ قصیدے اور مثنوی میں بھی برابر انھیں کا عمل دخل رہا ہے۔ فارسی اور اُردو زبانوں میں چند کے سوا کل مثنویاں عشقیہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ اسیطرح قصائد کی تمہیدوں میں بھی زیادہ تر یہی دکھڑا رویا گیا ہے۔ واسوخت تو عشق کی پسلی ہی سے پیدا ہوا ہے لیکن چونکہ قصیدہ، مثنوی اور

واسوخت کا میدان وسیع ہے۔ لہذا اُنمیں غریب اور اجنبی الفاظ کی بہت کچھ کھپت ہوسکتی ہے۔ بخلاف غزل کے کہ یہاں ایک لفظ بھی غیر مانوس ہو تو اوپرا معلوم ہوتا ہے۔ گلاب کے تختہ میں کانٹے بھی پھولوں کیساتھ نبھ جاتے ہیں۔ مگر گلدستہ میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے اسیواسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے انکو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیئے جاتے تھے اُنھیں الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ و تمثیل میں اپنے اعلیٰ خیالات ظاہر کیئے ہیں پس غزل میں ضرور ہے کہ نسبت اَور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اُردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی ہے وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا ہے۔ اُردو میں **ولی** سے لیکر **انشا** اور **مصحفی** تک عموماً سب کی غزلمیں صفائی۔ سادگی۔ روزمرہ کی پابندی۔ بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے۔ انکے بعد دلّی میں ممنون۔ غالب۔ مومن اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی ترکیبوں نے اُردو غزل میں بلاشک زیادہ دخل پایا۔ مگر یہ لوگ بھی اعلےٰ درجہ کا شعر اُسیکو سمجھتے تھے جسمیں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اُردو کے محاورہ میں ادا ہو جاتا تھا۔ اُن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ "غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک یا دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعرا شتر گربگی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ ایک دو شعر اچھا نکل آیا۔ باقی کم وزن اور پھسپھسے شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا۔ ہم لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے

چست کر دیتے ہیں تاکہ بادی النظر میں حقیر نہ معلوم ہوں،، بات یہ ہو کہ یہ لوگ انھیں معمولی خیالات کو جودت سے مختلف شکلوں میں بندھتے چلے آتے تھے بہت کم باندھتے تھے بلکہ ہر شعر میں جدّت پیدا کرنی چاہتے تھے۔ اسلیئے اردو روزمرہ کا سررشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا تھا۔ باایں ہمہ غزلیت کی شان اُنکے تمام کلام میں پائی جاتی ہے اور صاف و بامحاورہ اور بلند اشعار اُنکے ہاں بھی نسبۃً اُتنے ہی نکل سکتے ہیں جتنے کہ قدما کی غزلیات میں۔ **ذوق** کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں **ظفر** کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے۔ لیکن اُسمیں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ **داغ** کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی۔ روزمرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور تیکھا پن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہو۔ مگر نہایت تعجب ہو کہ **لکھنؤ** میں متاخرین نے سادگی اور صفائی کا غزل میں بہت کم خیال رکھا ہے۔ باوجودیکہ زبان کے لحاظ سے دلّی اور لکھنؤ میں کوئی معتدبہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اسکے سوا **شجاع الدولہ** کے زمانہ سے **سعادت علی خاں** کے وقت تک اُردو کے تمام نامور شعرا کا جمگھٹا لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر۔ سودا۔ سوز۔ جرأت مصحفی اور انشا وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے۔ مگر متاخرین کی غزل میں اُنکی طرزِ بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلّی بگڑ چکی۔ اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلّی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا

لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی۔ اُسوقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جسطرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہمکو فوقیت حاصل ہی اسیطرح زبان اور لب و لہجہ میں بھی ہم دلّی سے فایق ہیں۔ لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنیکے لیئے ضرور تھا کہ اپنی اور دلّی کی زبان میں کوئی امر ما بہ الامتیاز پیدا کرتے۔ چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی خود بخود طبیعتیں اسباب کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُنکی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔ یہانتک کہ سیدھی سادی اُردو اُمرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہوگئی بلکہ جیسا ثقات سے سُنا گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔ نظم میں **جرأت** اور **ناسخ** کے دیوان کا اور نثر میں **باغ و بہار** اور **فسانہ عجائب** کا مقابلہ کرنیسے اسکا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بااینہمہ انصاف یہ ہے کہ مرثیہ اور مثنوی میں خاص خاص شخصوں پر (جیسا کہ آگے بیان کیا جائیگا) زمانہ کے اقتضا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ اُنھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اُسکو بزرگوں کا تبرک سمجھکر اس انقلاب کے زمانہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔

بہر حال غزل میں زبان اور بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضرور ہے

۱۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہی۔ بلکہ اُسکو ہر قسم کے جذبات کا ارگن بنانا چاہیئے۔ یہ بھی ظاہر ہے

کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے اُسکی ایک خاص زبان قرار پاگئی ہے اور وہ اسقدر کانوں میں رچ گئی ہے کہ اگر دفعۃً اُسمیں کثرت سے غیر مانوس اور اجنبی ترکیبیں اور اسلوب بیان داخل ہوجائیں تو غزل ایسی ہی گھٹل ہوجائے جیسی کہ بعض شعرا کی غزل عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اختیار کرنیسے ہوگئی ہے۔ حالانکہ غزل کو باعتبار مضامین کے وسعت دینا بظاہر اسبات کا مقتضی ہے کہ زبان اور طریقہ بیان کو بھی وسعت دیجائے۔ پس ضرور ہی کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طریقہ بیان میں دفعۃً کوئی بڑی تبدیلی بھی واقع نہو اور باوجود اسکے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہوسکیں

آجکل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے بیاس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعرا نے کبھی نہیں باندھے تھے ظاہر کیئے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ اُس خاص زبان میں جو شعرا کی کثرت استعمال سے کانوں میں رچ گئی ہے ادا نہیں کیئے جاتے۔ بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں۔ اُنھیں الفاظ میں ظاہر کردیئے جاتے ہیں اسلیئے وہ مقبول خاص و عام نہیں ہوتے۔ لیکن نئی طرز کی عام شاعری اگر سردست مقبول نہ ہو تو کچھ حرج نہیں جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اُس سے آشنا ہوجائینگے۔ اور سچی باتوں کی لذت اور حلاوت سے واقف ہونگے۔ اُسوقت وہ خود بخود مقبول ہوجائے گی۔ البتہ غزل کو ابتدا ہی سے جہانتک ممکن ہو عام پسند اور مطبوع طبائع بنانا ضرور ہے۔ کیونکہ یہی ایسی صنف ہی۔ جو خاص و عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اِسی کے اشعار ہر شخص کو بآسانی یاد رہ سکتے ہیں اور یہی تمام خوشی کے جلسوں اور سماع کی مجلسوں اور یاروں کی صحبتوں میں گائی

اور بڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں نیچرل شاعری پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیے جائیں۔ اُسکو تمام انسانی جذبات کے ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اسکے اُسکو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہو۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اول اول اُسی زبان اور اُسی روزمرہ میں ادا ہونی چاہئیں جسمیں پُرانے اور پست خیالات ادا کیے جاتے تھے یہ ہے کہ کلام الٰہی میں تمام روحانی اور اخلاقی باتیں ویسے ہی محاورات و تشبیہات و استعارات و تمثیلات میں بیان کی گئی ہیں جنمیں شعرائے جاہلیت عشقیات و خمریات اور تفاخر و مدح و ذم وغیرہ کے مضامین بیان کرتے تھے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعۃً ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہوجائے مگر زبان میں دفعۃً وسعت پیدا نہیں ہوسکتی۔ بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں اور اُنکو رفتہ رفتہ پبلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے۔ اور قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں اُنکو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شاعرانہ خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہوجائیں۔ تو بھی جن الفاظ کے ذریعہ سے وہ خیالات ظاہر کیے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیے جاتے۔ فرض کرو کہ آسمان کا وجود اور اُسکا گردش کرنا۔ زمین کا ساکن ہونا۔ پانی اور ہوا کا بسیط ہونا۔ عناصر کا چار میں منحصر ہونا۔ جام جم کا جہاں نما ہونا۔ ظلمات میں چشمۂ حیواں کا مخفی ہونا۔ سیمرغ او

دیو و پری کا موجود ہونا اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں علم انسانی کی ترقی سے غلط ثابت ہوجائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بالکل دست بردار ہوجائے۔ بلکہ اُسکا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو انھیں غلط اور بے اصل باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور اُس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے۔ ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اُسنے اپنے منتر میں سے وہی انچھر بھلا دیئے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے

بہرحال جو لوگ اُردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اُسکو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں انکا فرض ہے کہ اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیئے جائیں اور غیر مانوس الفاظ کم برتے جائیں۔ مگر نا معلوم طور پر رفتہ رفتہ اُنکو بڑھاتے رہیں۔ اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور معمولی الفاظ و محاورات پر رکھیں۔ مگر الفاظ کے حقیقی معنوں ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ اُنکو کبھی حقیقی معنوں میں کبھی مجازی معنوں میں۔ کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرایہ میں استعمال کریں۔ ورنہ ہر قسم کے خیالات ایک سیدھی تُلی زبان میں کیونکر ادا کیئے جا سکتے ہیں۔ ہم اس مقام پر **علم بیان** کے اصول جنسے ایک ایک مطلب کو متعدد پیرایوں میں ادا کرنا۔ اور ایک ایک لفظ کو مختلف موقعوں میں برتنا آتا ہے۔ بیان کرنے نہیں چاہتے۔ کیونکہ اُنکی تفصیل عربی۔ فارسی اور نیز اُردو رسالوں میں مل سکتی ہے۔ مگر ہم فارسی اور اُردو غزل کے کسیقدر اشعار بطور مثال کے نقل کرتے ہیں جنمیں اخلاق اور تصوف کے مضامین عشق مجازی اور تغزل کے پیرایہ میں ادا کیئے گئے ہیں

اور اجنبی خیالات کے ظاہر کرنے میں ایک محدود اور معمولی زبان سے کام لیا گیا ہے۔

از دیوان خواجہ حافظ

مضمون	طرز بیان
تمام عالم خدا کا نادیدہ مشتاق اور طالب ہے	روئے تو کس ندید و ہزارت رقیب ہست در غنچہ ہنوز و صدت عندلیب ہست
خدا کے طالب صادق کبھی محروم نہیں رہتے	عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد ای خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست
دوست کو الزام دیکر شرمندہ کرنا شرط دوستی کے برخلاف ہے۔	صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت ناز کم کن کہ دریں باغ بسی چون تو شگفت گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولی ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نگفت
اقبالمندی کا زمانہ ہمیشہ نہیں رہتا۔	گفتم اے مسند جم جام جہان بینت کو گفت افسوس کہ آن دولت بیدار بخفت
جس طاعت میں ریا کا لگاؤ ہو اس سے معصیت بہتر ہے۔	ساقی بیار بادہ کہ ماہ صیام رفت در دہ قدح کہ موسم ناموس و نام رفت وقت عزیز رفت۔ بیا تا قضا کنیم عمرے کہ بے حضور صراحی و جام رفت

مضمون	طرزِ بیان
باوجودیکہ خدا تک کسی کی رسائی نہیں پھر اُسکے بھید دنیا میں کیونکر ظاہر ہوگئے۔	صبا زروی تو با ہر گلے حدیثے کرد رقیب چوں رہِ غماز داد در حرمت
سب کوششوں میں ناکام ہوکر خدا کی طلب میں کوشش کرنی۔	عشق می ورزم و امید کہ ایں فنِ شریف چوں ہنرہای دگر موجب حرماں نشود

از دیوان خواجہ میر درد

مضمون	طرزِ بیان
دنیا میں سب سے ملنا مگر سب سے بے تعلق رہنا۔	اے درد یہاں کسو سے نہ دل کو لگائیو لگ چلیو سب سے یوں تو پہ جی مت پھنسائیو
قربِ الٰہی میں بڑے بڑے خطرات ہیں۔	کاش تا شمع نہ ہوتا گذرِ پروانہ تمنے کیا قہر کیا بال و پرِ پروانہ
سالک کی غایت مقصود فنا ہے۔	ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اُس نے رہروو! رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ
سرِ باطن کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہیئے۔	ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے کوئی اس[8] بات سے نہ ہو آگاہ
بندہ اور خدا کے بیچ میں کسی واسطہ کی گنجائش نہیں۔	قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے اُسکا پیام دل کے سوا کون لا سکے

8 اس بات کے لفظ میں جو لطف ہو اُسکو اہلِ زبان سمجھ سکتے ہیں ۱۲

مضمون	طرز بیان
کائنات کے تمام جلوے مظہر تجلیات الٰہی ہیں	گذرا ہے صبا کون بتا آج ادھر سے گلشن میں۔ ترے پھولوں کی یہ باس نہیں ہے
کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ	دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
باخدا لوگوں کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے۔	بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے درد کہ بو گلاب کی آتی ترے پسینے سے
عشق الٰہی تمام تعلقات سے نجات دیتا ہے	اُسکے خیال زلف نے سب سے ہمیں چھڑا دیا گرچہ پھنسے ہیں دام میں دل کو مگر فراغ ہے
جہاں موت کا کھٹکا ہو وہاں ایک دم یاد خدا سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔	ساقیا یہاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

از دیوان سودا

مضمون	طرز بیان
شیخ کو چاہیئے کہ سالک کو تعلیم فنا سے پہلے دنیا کے تعلقات سے متنفر کرے۔	خانہ پرورد چمن ہیں آخر اے صیاد ہم اتنی رخصت دے کہ ہولیں گل سے ٹک آزاد ہم
دنیا میں فی الحقیقۃ کوئی چیز دلبستگی کے قابل نہیں	خندۂ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر اس چمن سے کہہ تو۔ جاکر کیا کرینگے یاد ہم
دنیا کی کسی نعمت کو ثبات نہیں۔	اے گل صبا کی طرح پھرے اس چمن میں ہم

مضمون	طرزِ بیان
	پائی نہ بو وفا کی ترے پیرہن میں ہم
دنیا میں عروج کیسا تھا ہی تنزل لگا ہوا ہے	نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبح چمن تیرا
	گل ادھر لیگئے گلچیں گئی روتی اُدھر شبنم
جو دنیا کو بے ثبات جانتے ہیں وہ بھی اپنی بے	بھلا گل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر
ثباتی سے غافل ہیں۔	بتا روتی ہے کس کی ہستیٔ موہوم پر شبنم
خدا کی۔ بندے کی۔ قوم کی۔ ملک کی کسی کی	دلا اب سر کو اپنے پھیر مت سنگ ملامت سے
محبت کیوں نہو اُسپر ملامت ہونی ضرور ہے	یہی ہوتا ہے ناداں عشق کا انجام دنیا میں
جو کام کرنے ہیں اُنہیں دیر کرنی نہیں چاہیئے۔	ساقی ہے اک تبسمِ گل فرصتِ بہار
	ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے کہیں بھر بیا
جسقدر دُنیا کی محبت بڑھتی جاتی ہے اُسیقدر	اس کشمکش سے دام کی کیا کام تھا ہمیں
مشکلات زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔	اے اُلفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

ذوق

مضمون	طرزِ بیان
اگر دلوں میں دنیا کی محبت باقی نہ رہے تو دنیا	بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
کے سب کام بند ہو جائیں۔	پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
بہت سے جوہرِ قابل پہلے اس سے کہ اپنے جوہر	کِھل کے گل کچھ تو بہار اپنی۔ صبا! دکھلا گئے
دکھلائیں خاک میں ملجاتے ہیں۔	حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کِھلے مرجھا گئے

مضمون	طرز بیان
توکل کی شان۔	احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
تعلقات دنیوی کے نتائج۔	اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے لگایا جی کو اپنے روگ جب سے دل لگا بیٹھے

غالب

مضمون	طرز بیان
عُزلت نشینی میں کوئی خطرہ نہیں۔	نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
تیز زبان آدمی کی ہر کوئی شکایت کرتا ہے	گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اسقدر کی جس سے بات اُسنے شکایت ضرور کی
رنج اور تکلیف سب خدا کیطرف سے ہے۔	جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس رنگ میں جو آئے
غلبہ یاس میں مطلب ہاتھ سے جاتا رہتا ہے	سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
خدا تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔	تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

شیفتہ

طرزِ بیان	مضمون
فانوس و شیشہ و لگن زر سے کیا حصول وہ ہے وہاں جہاں نہیں روغن چراغ میں	خدا غریبوں کے جھونپڑے میں ہے۔
ہی امتزاج مشک مئے لعل فام میں آتی ہے بوئے غیر ہمارے مشام میں	مشائخ کے ہر ایک سلسلہ کی نسبت میں جدا جدا کیفیت ہوتی ہے۔
نفس سرکش کی کسی ڈھب سے رعونت کم ہو چاہتا ہوں وہ صنم جس میں محبت کم ہو	نفس کی رعونت جس طریقہ سے کم ہو سکے بہتر ہے۔
وہ آہوئے رمیدہ کہ ہم جسکے صید ہیں نہ وادیِ تتار نہ دشتِ ختن میں ہے	خدا کی ذات مکان اور جہت سے پاک ہے۔
ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے	لہو و لعب سے دفعۃً کنارہ کش ہو کر اطمینان کلی حاصل کرنا۔

اگرچہ اس قسم کے اشعار سے فارسی کے خاص خاص دیوان بھرے ہوئے ہیں اور اُردو میں بھی تلاش کرنیسے ایسے اشعار اور زیادہ دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ اسلوب زیادہ تر تصوف کے مضامین سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ ہر قسم کے نیچرل خیالات ادا کرنے کے لئے صرف یہی اسلوب کافی نہیں ہو سکتے جب تک کہ شاعر انکو عمدہ طور پر ہر موقع کے مناسب استعمال کرنے کی لیاقت اور انھیں میں ملتے جلتے نئے اسلوب پیدا کرنیکا ملکہ نہ رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک اسکا گُر یہ ہے کہ جہانتک ہو سکے استعارہ و کنایہ و تمثیل کے استعمال اور محاورات کے

برتنے پر قدرت حاصل کرنی چاہیئے۔

استعارہ وکنایہ اورتمثیل کی تعریف اورانکی قسمیں علم بیان کی کتابوں میں دیکھنی چاہیئں یہاں ہم صرف اسقدر کہنا چاہتے ہیں کہ استعارہ بلاغت کا ایک رکن اعظم ہے اور شاعری کو اُسکے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ ہی کے قریب قریب ہے۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انھیں کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے۔ اور جہاں اُسکو اپنا منتر کارگر ہوتا نظر نہیں آتا وہاں انہیں کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

بعض مضامین فی نفسہ ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں کہ اُنکو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے۔ مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان اُنکو ادا کرتے وقت رو دیتی ہے اور معمولی اسلوب اُنمیں اثر پیدا کرنیسے قاصر ہوتے ہیں ایسے مقام پر اگر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل وغیرہ سے مدد نہ لیجائے تو شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معمولی بات چیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً داغ کہتے ہیں۔

دلِ بیتاب وہاں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا گیا تھا کہکے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی

اس شعر میں دیر لگانے کو موت آنے اور مر رہنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ دونو لفظ نہ ہوں بلکہ اسطرح بیان کیا جائے کہ قاصد نے تو بہت دیر لگائی اے دل کہیں تو بھی دیر نہ لگائیو تو شعر میں کچھ جان باقی نہیں رہتی۔

یا مثلاً مرزا **غالب** کہتے ہیں۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے مصرع میں طنزاً بطور استعارہ کے "دیر پشیماں" کی جگہ "زود پشیماں" کہا گیا ہے جس سے شعر میں جان پڑگئی ہے۔ یہ ویسا ہی استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں اَنْذِرْهُمْ کی جگہ بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ فرمایا ہے۔

اسیطرح **میر تقی** کہتے ہیں۔

کہتے ہو اتحاد ہے ہمکو ہاں کہو اعتماد ہے ہمکو

یہاں بھی "اعتماد نہیں ہے" کی جگہ طنزاً "اعتماد ہے" کہا گیا ہے۔

مرزا **غالب** کہتے ہیں۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دوسرے مصرع کا اصل مدعا یہ تھا کہ وفاداری ایسی عمدہ صفت ہے کہ اگر برہمن وفاداری کیساتھ ساری عمر بتخانہ میں نباہ دے تو اُسکے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان کے ساتھ کرنا زیبا ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اگر وہ بتخانہ میں مرے تو اُسکو کعبہ میں دفن کرنا چاہیے۔ جو خوبی اس عنوانِ بیان میں ہے وہ ظاہر ہے۔

دوسری جگہ مرزا **غالب** کہتے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھکے گھر یاد آیا

دوسرے مصرع میں بطور کنایہ کے "خوف معلوم ہوا" کی جگہ "گھر یاد آیا" کہا گیا ہے کیونکہ

جنگل میں خوف معلوم ہونے کو گھر یاد آنا لازم ہے، اور چونکہ اسمیں صنعتِ ایہام بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اسلئے شعر میں اور زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی اسمیں یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اسقدر ویران ہے کہ دشت کو دیکھکر گھر یاد آتا ہے۔

مرزا **غالب** کا فارسی شعر ہے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز ۔۔۔ گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

اس شعر میں اپنی مشکلات اور سختیوں کو بطور تمثیل کے بیان کیا ہے۔ جس حالت کو شاعر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے وہ کچھ ہی کیوں نہو اگر اسکو صاف اور سیدھے طور پر جیسی کہ وہ ہے بیان کیا جائے تو وہ ہرگز دو مصرعوں میں نہیں سما سکتی۔ اور باوجود اسکے جس ہیبت ناک صورت میں اُسکو یہ تمثیل کا پیرایہ ظاہر کرتا ہے یہ بات ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔

مرزا **غالب** کا اُردو شعر ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۔۔۔ اُڑنے نپائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر میں بھی اسبات کو کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقات دنیوی میں پھنسا بطور تمثیل کے بیان کیا ہے۔ اور اس عنوان بیان کی خوبی ظاہر ہے۔

بہر حال شاعر کا یہ ضروری فرض ہے کہ مجاز و استعارہ و کنایہ و تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے تاکہ ہر روکھے پھیکے مضمون کو آب و تاب کے ساتھ بیان کر سکے۔ مگر استعارہ وغیرہ میں اسبات کا خیال رکھنا ضرور ہے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں ورنہ شعر چیستان و معما ہو جائیگا۔ مثلاً **شاہ نصیر** کہتے ہیں۔

چرائی چادرِ مہتاب شب مہکش نے جیحوں پر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

چادرِ مہتاب چرانے سے۔ چاندنی کا لطف اٹھانا اور اس سے متمتع ہونا مراد رکھا ہے جو نہایت بعید الفہم ہے۔ جن لوگوں نے استعارہ وغیرہ کے استعمال میں مذکورۂ بالا اصول کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اُنکا کلام ہمیشہ نامقبول اور متروک رہا ہے۔ جیسے بدر چاچ کے قصائد جنمیں نہایت بعید الفہم استعارے استعمال کیئے گئے ہیں۔ کہیں آہوے مادہ سے آفتاب مراد لی ہے۔ کہیں اشک زلیخا سے کوکب۔ کہیں اعمیٰ سے برج عقرب۔ کہیں برگ بنفشہ سے حروف۔ کہیں آب خشک سے پیالہ۔ کہیں پنج دریا سے پانچ انگلیاں۔ اور اسیطرح کہیں زمین سے آسمان اور کہیں آسمان سے زمین۔

اُردو میں شعرا نے استعارہ کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے۔ کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کرکے دیکھا جائے تو استعارہ پر ہوتی ہے مثلاً جی اچٹنا اسمیں جی کو اُن چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اُچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر۔ پتھر۔ گیند وغیرہ۔ یا مثلاً جی بٹنا۔ اسمیں جی کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جو منقسم اور متفرق ہو سکے آنکھ کھلنا۔ دل کملانا۔ غصہ بھڑکنا۔ کام چلنا۔ اور اسیطرح ہزارہا محاورے استعارہ پر مبنی ہیں۔ اور یہ وہ استعارے ہیں جنہیں شعرا کی کارستانی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ نیچرل طور پر بغیر فکر اور تصنع کے اہلِ زبان کے مونہ سے وقتاً فوقتاً نکلکر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوا ہے۔ مگر اردو شعرا نے تمثیل کو بہت کم برتا ہے۔ البتہ نئی طرز کی شاعری میں اسکا کچھ کچھ رواج ہوتا چلا ہے اور

ضرورت نے لوگوں کو اسکے برتنے پر مجبور کیا ہے چونکہ اس موقع پر استعارہ کی تقریب سے محاورہ کا ذکر آگیا ہے اسلیئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محاورہ کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کیجائیں۔

ب **محاورہ** لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں خواہ وہ بات چیت اہل زبان کے روزمرّہ کے موافق ہو خواہ مخالف۔ لیکن اصطلاح میں خاص اہل زبان کے روزمرّہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ **محاورہ** تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرّہ یا بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لُغت کے کہ اُسکا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بمنزلہ مفرد کے ہیں کیا جاتا ہے۔[8] مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ دونو کو ملا کر جب پانسات بولینگے۔ تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے قیاسی نہو۔ بلکہ معلوم ہو کہ اہل زبان اسکو اسیطرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانسات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اُسکو محاورہ نہیں کہنے کے۔ کیونکہ اہل زبان کبھی اسطرح نہیں بولتے۔ یا مثلاً بلا ناغہ پر قیاس کر کے اُسکی جگہ بے ناغہ۔ ہر روز کی جگہ ہر دن۔ روز روز کی جگہ دن دن۔ یا آئے دن کی جگہ آئے روز بولنا۔ ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ الفاظ

8 جیسے تیس اور کتیس۔ تیس مفرد ہے۔ اور کتیس مرکب بمنزلۂ مفرد ۱۲

اسطرح اہل زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا اطلاق خاصکر اُن افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کیساتھ ملکر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اُتارنا۔ اسکے حقیقی معنی کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو اتارنا کھونٹی سے کپڑا اُتارنا۔ کوٹھے پر سے پلنگ اُتارنا۔ لیکن ان میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقشہ اُتارنا۔ نقل اُتارنا۔ دل سے اُتارنا۔ دل میں اُتارنا۔ ہاتھ اُتارنا۔ پہنچا اُتارنا۔ یہ سب محاورے کہلائینگے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنے کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے۔ یا مثلاً کھانا۔ اسکے حقیقی معنی کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اُتارنے کے ہیں مثلاً روٹی کھانا۔ دوا کھانا افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسیکو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا۔ قسم کھانا۔ دھوکا کھانا۔ پچھاڑیں کھانا۔ ٹھوکر کھانا یہ سب محاورے کہلائینگے۔

محاورہ کے جو معنی ہمنے اول بیان کیئے ہیں وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں لیکن دوسرے معنی پہلے معنی سے خاص ہیں پس جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اسکو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اسکو دوسرے معنوں

کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا ٹنٹا کرنا)۔ اسکو دونو معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ترکیب اہل زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے۔ اور نیز اسمیں "تین پانچ" کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ لیکن روٹی کھانا۔ یا میوہ کھانا۔ یا پانسات یا دس بارہ وغیرہ صرف پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پا سکتے ہیں۔ نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے۔ کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہل زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں۔ مگر انمیں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا۔ آئندہ ہم ان دونو معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورہ پر **روزمرہ** کا اور دوسری قسم پر **محاورہ** کا اطلاق کرینگے۔

روزمرّہ اور **محاورہ** میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے۔ روزمرّہ کی پابندی جہانتک ممکن ہو تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ یہانتک کہ کلام میں جسقدر کہ روزمرہ کی پابندی کم ہوگی اُسیقدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا۔ مثلاً "کلکتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا"۔ یہ جملہ روزمرہ کے موافق نہیں ہے۔ بلکہ اسکی جگہ یوں ہونا چاہیئے۔ "کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا"۔ یا مثلاً "آج تک اُنسے ملنے کا موقع نہ ملا"۔ یہاں **نہ ملا** کی جگہ **نہیں ملا** چاہیئے۔ یا "وہ خاوند کے مرنیسے درگور ہوئی"۔ یہاں **زندہ درگور ہوگئی** چاہیئے۔ یا ؎ "سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہوگئیں"۔ یہاں **ہوگئیں** کی جگہ **ہوئیں**

کی جگہ **ہوئیں** چاہیے۔ یا " دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا " یہاں کیا **ہوگیا** چاہیئے۔

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں **روزمرّہ** کی پابندی جہانتک ممکن ہو نہایت ضروری ہے۔ مگر **محاورہ** کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے۔ لیکن ہر شعر میں محاورہ کا باندھنا ضرور نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھدیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے۔

" گوہر اشک سے لبریز ہے سارا دامن آج کل دامن دولت ہے ہمارا دامن "

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا۔ باوجود اسکے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے۔

" اسکا خط دیکھتے ہیں جب صیاد طوطے ہاتھوں کے اُڑا کرتے ہیں "

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے صرف ایک محاورہ بندھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی روزمرّہ کے خلاف یعنی **اُڑجاتے ہیں** کی جگہ **اُڑا کرتے ہیں** محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیئے۔ جیسے کوئی خوبصورت عضو۔ بدن انسان میں۔ اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیئے جیسے تناسب اعضا بدن انسان میں۔ جسطرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن بشری کامل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسیطرح بغیر روزمرّہ

کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بے جا رکھدینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہوسکتی۔

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونو کرسکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہل زبان کا حصہ ہے۔ اہل زبان عموماً اُس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جسمیں روزمرّہ کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اور اگر روزمرّہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ اُنکو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے۔ مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہی عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو سُنکر سر دُھننے لگتے ہیں۔ اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جب اُنھیں اسلوبوں میں وزن کی کھچاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں۔ اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو اُنکو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کیساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لیئے صرف روزمرہ کا وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہی۔ اُن کے نزدیک محض تک بندی اور معمولی بات چیت کو موزوں کردینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہی ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہے۔ تو بلا شبہہ اُنکو بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ فن شعر میں اور خاصکر اُردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال ور روزمرّہ میں پورا پورا ادا ہوجائے۔ جن لوگوں نے روزمرّہ کی پابندی کو سب

چیزوں سے مقدم سمجھا ہے اُنکے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فروگذاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روزمرّہ اور محاورہ میں بھی پورا اُترجائے تو لامحالہ اُس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب ہوتا ہے مثلاً **میر انشا اللہ خاں** اس بات کو کہ افسردگی کے عالم میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گذرتی ہے اسطرح بیان کرتے ہیں۔

"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"

یا مثلاً **مرزا غالب** اتنے بڑے مضمون کو کہ (میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھکر کچھ نہ کہا۔ جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اُسنے جانا کہ اسکا مطلب کچھ اور ہے۔ اُسنے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے) دو مصرعوں میں اسطرح بیان کرتے ہیں۔

"گدا سمجھکے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کے لیے"

یا مثلاً **مرزا غالب** کہتے ہیں۔

رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے اُسکو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ

رہتا ہے۔ لیکن جب راز فاش ہوجاتا ہے تو پھر اسکو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے **دھویا جانا** بے حیا اور بے لحاظ ہوجانے کو کہتے ہیں۔ اور **پاک** آزاد اور شُہدے کو کہتے ہیں۔ رونے کے لیئے دھویا جانا اور دھوئے جانے کے لیئے پاک ہونا۔ باوجود اتنی لفظی مناسبتوں اور محاورہ کی نشست اور روزمرہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہوگیا ہے۔ اور کوئی بات اَن نیچرل نہیں ہے یا مثلاً **مومن خاں** کہتے ہیں۔

"کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چُرا گئے ۔۔۔ کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے"

آنکھیں چُرانا۔ اغماض و بے توجہی کرنا ہے۔ **کھویا جانا** شرمندہ اور کھسیانا ہونا **پا جانا** سمجھ جانا۔ یا تاڑ جانا معنی ظاہر ہیں۔ اس شعر کا مضمون بھی بالکل نیچرل ہے اور محاورات کی نشست اور روزمرہ کی صفائی قابل تعریف ہے۔ اگرچہ اسکا ماخذ مرزا **غالب** کا یہ شعر ہے۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق ۔۔۔ پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جاتا ہے

مگر **مومن** کے ہاں زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔ اسی قبیل کے یہ اشعار ہیں۔

ذوق — رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو ۔۔۔ تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

رشک — چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ ۔۔۔ ہر قدم پر ہے یقیں یہاں رہ گیا وہاں رہ گیا

بیتاب — جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد ۔۔۔ ہمیں آکے اس کے قدم دیکھتے ہیں

شیفتہ — شاید اسیکا نام محبت ہے شیفتہ ۔۔۔ ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

یوں وفا اُٹھ گئی زمانے سے کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

الغرض روزمرہ کی پابندی تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہانتک ہوسکے نہایت ضروری چیز ہے۔ اور محاورہ بھی بشرطیکہ سلیقہ سے باندھا جائے شعر کا زیور ہے۔ چونکہ یہ بحث بہت طولانی ہے۔ اسلئے ہم اسکو یہیں ختم کردیتے ہیں اگر موقع ملا تو پھر کبھی اس مضمون پر علیحدہ اپنے خیالات ظاہر کرینگے۔

ج صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سررشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ مخاطب کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہی ہے بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کردیتا ہے۔ پس صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ صنعتیں جیسا کہ علم بلاغت میں مفصل مذکور ہے دو قسم کی قرار دی گئی ہیں۔ ایک معنوی۔ جیسے طباق۔ مشاکلہ۔ عکس توریہ حسنِ تعلیل۔ تجاہلِ عارفانہ۔ تعجب وغیرہ۔ دوسری لفظی۔ جیسے تجنیس۔ ردّ العجز علی الصدر منقوط۔ غیر منقوط۔ رقطا۔ خیفا۔ مقطع۔ موصل۔ ترصیع وغیرہ۔ پہلی قسم کی کل صنعتیں اور دوسری قسم کی خاص خاص صنائع عربی اور فارسی کے تمام نامور شعرا نے برتی ہیں مگر کبھی اُنکا التزام نہیں کیا۔ اور کلام کی بنیاد اُنپر نہیں رکھی۔ ہاں اگر حسن اتفاق سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ سوجھ گیا جس سے معنی مقصود میں کچھ خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حسن پیدا ہوجائے ایسے موقع کو بلاشبہہ ہاتھ سے جانے نہیں

دیا۔ جیسے **خواجہ حافظ** کہتے ہیں۔

بزیرِ دلق ملمع کمندہا دارند درازدستی این کوتہ آستینان بین

اس شعر میں **دراز** اور **کوتہ** کے لحاظ سے صنعت طباق اور دست و آستین کے اعتبار سے مراعاۃ النظیر ہی۔ مگر دونو صنعتیں ایسی بے تکلف اور مناسب طور پر واقع ہوئی ہیں کہ معنیٔ مقصود میں بجائے اسکے کہ مُخل ہوں اَور زیادہ قوت پیدا کردی ہی اور شعر کا حسن دوبالا کردیا ہے یا جیسے **میر تقی** کہتے ہیں

یہ جو چشم پُر آب ہیں دونو ایک خانہ خراب ہیں دونو

اسمیں **ایک** کا لفظ ایسا بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے اُسکا قصد ہی نہیں کیا۔ یہاں **ایک** کے معنی ہیں نہایت۔ بے مثل۔ لاجواب چھٹا ہوا۔ جیسے کہتے ہیں وہ ایک بدذات ہی۔ یا وہ لوگ ایک شورہ پشت ہیں **دونو** کے مقابلہ میں **ایک** کے لفظ نے آکر شعر کو نہایت بلند کردیا ہی۔ ورنہ نفس مضمون کے لحاظ سے اُسکی کچھ بھی حقیقت نہ تھی۔ یہاں فی الحقیقۃ محض صنعتِ مراعاۃ النظیر نے اس شعر میں اعلے درجہ کی بلاغت پیدا نہیں کی۔ بلکہ اس بات نے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر لفظاً **ایک** کا اطلاق ایسی خوبی اور بے تکلفی سے ہوا ہے کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتا۔ ورنہ ایک شعر یا ایک مصرع میں **ایک** اور **دو** کا جمع کردینا کہ اسیکا نام مراعاۃ النظیر ہے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

حسن مطلع

دیدہٗ و دل عذاب ہیں دونو ایک سب آگ ایک سب پانی

اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بےتکلفی سے واقع ہوا ہے۔ پس اگر اس قسم کی مناسبتِ لفظی اتفاق سے شعر میں پیدا ہو جائے تو یہ شاعری کا زیور ہے۔ مگر قصداً ایسی رعایتوں کی جستجو کرنے سے آخر کار شاعری شاعری نہیں رہتی۔ بلکہ مسخراپن ہو جاتا ہی ایک مشہور شاعر فرماتے ہیں۔

"مرغ دلکو توڑے گی بلّی تیرے دروازہ کی رختِ تن کو کترےگا چوہا تمھاری ناک کا"

چونکہ **بلّی** کے لیئے **چوہا** لانا واجبات سے تھا۔ اسلیئے جب اصلی چوہا نہ ملا ناچار ناک ہی کے چوہے پر قناعت کی۔

کھانے کی اصل خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو۔ مفید ہو۔ جزوِ بدن بننے کے لائق ہو۔ بوباس اور رنگ روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصل خوبی یہ ہی کہ نیچرل ہو سوثر ہو۔ لفظاً اور معنیً سانچہ میں ڈھلا ہو۔ اگر اسکے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اُسمیں پائی جائے تو اور بہتر ہے۔ ورنہ اُسکی کچھ ضرورت نہیں۔

ہر زبان میں صنعتِ الفاظ (اگر ہمارا قیاس غلط نہیں ہی) متقدمین کی نسبت متاخرین کے کلام میں زیادہ پاؤگے۔ کیونکہ اکثر متاخرین اُنھیں مضامین کو دہراتے ہیں جو اُنسے پہلے قدما باندھ گئے ہیں۔ پس تاوقتیکہ وہ صنعتِ الفاظ کو کام میں نہ لائیں اُنھیں معمولی باتوں میں کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔

متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جنمیں باوجود حسنِ معنی کے اتفاق سے کوئی لفظی مناسبت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ وہ اشعار عموماً پسند کیے جاتے ہیں بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرلیتے ہیں کہ انکی مقبولیت کا سبب وہی لفظی مناسبت ہی اور بس۔ اب وہ بتکلف انھیں صنعتوں کو اپنے کلام میں جا و بے جا استعمال کرنا شروع کرتے ہیں اور جو اصل خوبی قدما کے کلام میں ہوتی ہے اُسکا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اسکی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک جامہ زیب اور حسین آدمی جیپر کوئی لباس بدنما نہیں معلوم ہوتا۔ اتفاق سے بنت کی ٹوپی یا کارچوبی انگرکھا پہنکر نکلے اور لوگ اُسکی ریس سے ویسے ہی کپڑے پہننے لگیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اُسکی زیبائش کا اصل سبب حسن و جمال ہے نہ بنت کی ٹوپی اور کارچوبی انگرکھا +

صنعتِ الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے تمام لٹریچر کو بے انتہا صدمہ پہنچایا ہی جسکی تفصیل کے لیئے ایک جداکتاب لکھنے کی ضرورت ہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جسطرح عجائب قدرت کی تعظیم ہوتے ہوتے آخرکار دنیا میں عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا۔ اسیطرح ہمارے لٹریچر میں صنائع لفظی کی لے بڑھتے بڑھتے آخرکار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا۔ صنائع و بدائع کی پابندی دلی کے شعرا میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شعرا نے اسکا سخت پابندی کے ساتھ التزام کیا ہے۔ اور بمقابلہ اہل دہلی کے لکھنؤ کے عام شعرا بھی رعایت لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی فارسی کے مقابلہ میں اُردو شاعری اس

آفت سے بہت محفوظ ہے۔ جہانتک ہمکو معلوم ہے وہ بیہودہ لفظی صنعتیں جنمیں معنی سے بالکل قطع نظر کرلیجاتی ہے۔ اور محض ایک لفظوں کا گورکھ دھندا بنایا جاتا ہے جیسے منقوط غیر منقوط۔ رقطا۔ خیفا۔ ذو قافیتین۔ ذو بحرین وغیرہ وغیرہ۔ اُردو شاعری میں کمیاب ہیں مگر بجائے صنائع لفظی کے اُردو غزل میں ایک اور روگ پیدا ہوگیا ہے۔ جو صنائع سے بھی زیادہ معنی کا خون کرنے والا ہے۔

د سنگلاخ زمینوں میں لکھنؤ اور دلی کے شعرائے متاخرین نے ہزارہا غزل لکھی ہے میر۔ سودا۔ جرأت۔ درد۔ اور آثر۔ کے ہاں ایسی زمینوں میں بہت کم غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اسکی ابتدا **مصحفی** اور **انشا** کے وقت سے ہوئی ہے۔ اور شاہ نصیر نے سب سے زیادہ اسمیں طبع آزمائی کی ہے۔ ذوق کو بھی ابتدائے شاعری میں اسکا بہت لپکا رہا ہے ظفر کے کلام میں بھی ایسی زمینیں بہت ہیں۔ البتہ غالب۔ مومن۔ ممنون۔ شیفتہ داغ۔ وغیرہ نے ایسی زمینیں بہت کم اختیار کی ہیں۔ لکھنؤ کے شعرا نے بھی سخت زمینوں میں بے انتہا غزلیں لکھی ہیں۔

جو لوگ شاعری کے فرائض پورے پورے ادا کرنے چاہتے ہیں وہ اسبات کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ شعر کے سرانجام کرنے میں کوئی چیز ایسی مشکل نہیں جیسا مضمون شعر کے مناسب قافیہ بہم پہنچانا۔ اسی لیئے جب کسیکو سخت دقت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اسکا قافیہ تنگ ہوگیا اسی قافیہ کی مشکلات سے بچنے کے لیئے یوروپ کے شعرا نے آخر کار ایک **بلینک ورس** یعنی نظم غیر مقفٰی نکال لی ہے۔ اور اب زیادہ تر وہاں اسیطرح کی نظم پر شاعری کا دارومدار ہے

ہمارے ہاں اسپر طرہ یہ ہو کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دُم چھلا اَور لگا لیا گیا ہے اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غزل میں اور خاصکر اُردو غزل میں تو اُسکو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اُردو دیوانوں میں غیر مردف غزلیں تلاش کیجائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جبکہ ردیف اور قافیہ کی گھاٹی خود دشوار گذار ہے تو اُسکو اَور زیادہ کٹھن اور ناقابلِ گذر بنانا اُنھیں لوگوں کا کام ہو سکتا ہے۔ جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ اور شاعری کا کمال محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس۔

جہانتک سنگلاخ زمینوں کا استقرا کیا جاتا ہے اُن میں **یا** تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جنمیں باہم کچھ مناسبت نہ ہو۔ مثلاً تقریر پشتِ آئینہ تخچپ پشتِ آئینہ۔ تدبیر پشتِ آئینہ۔ اور جبل کی مکھی۔ محل کی مکھی۔ دَول کی مکھی۔ اور عسس کی تیلیاں مگس کی تیلیاں۔ نفس کی تیلیاں۔ یا ردیف ایسی لمبی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آسکتی۔ جیسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں۔ سر پہ طرہ ہار گلے میں۔ گاہ خدنگ و گاہ کماں۔ غرضکہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جسمیں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو اور بامعنی شعر نکالنا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے سوا عام شعرا کے لیے قریب ناممکن کے ہو ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بہ ظاہر جاتی رہے۔ گویا تیل اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں اور امیر خسرو کی اَنمل میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے کھیر چرخہ ڈھول اور کتا ان چار چیزوں کا اسطرح پیوند ملایا ہے۔

"کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا"

ایک شاعر گلگیر اور پشت آئینہ کو اسطرح پیوند دیتا ہے۔

"آرسی پہنے ہوئے وہ گل جولیوے شمع کا ہم انگوٹھے کو کہیں گلگیر پشت آئینہ"

ایک اور شاعر نے گل اور مکھی کو اسطرح گانٹھا ہے۔

"صنعت لعبت چین دیکھ دلاجاکر تو دیکھنی گر تجھے منظور ہو گل کی مکھی"

اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے کہ کل سنگلاخ زمینوں میں اسکے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ دو بے میل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے۔ پس شاعر کو چاہیئے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو۔ اور ردیف و قافیہ دونو ملکر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردّف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہیئیں۔ اور صرف محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیئے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیئے۔ جسکے لیئے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے الفاظ موجود ہوں۔ ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا قافیے مضمون کے تابع نہونگے۔ جتنے نامور شعرا گذرے ہیں اُنہوں نے یہی اصول ملحوظ رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جنمیں ہر قسم کے مضمون کی گنجایش ہو۔

قصیدہ

قصیدہ بھی اگر اُسکے معنی مطلق مدح و ذم کے لیئے جائیں۔ اور اُسکی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہو۔ جسکے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور اپنے بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات کسی چیز کو

دیکھکر یا کسی واقعہ کو سُنکر بے اختیار ہمارے دلمیں مدح و ستایش یا نفرین و ملامت کا جوش اُٹھتا ہے۔ کبھی کسیکے عدل و انصاف یا عالی ہمتی۔ یا حُبّ وطن یا قومی ہمدردی یا اور کسی خوبی کو معلوم کرکے اُسکی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی کسی نیک صفات اور ستودہ خصائل آدمی کی موت پر افسوس کرنے اور اُسکی خوبیاں یاد کرنیکا ولولہ دلمیں پیدا ہوتا ہے کبھی ہمکو اپنے گذشتہ دوستوں کی صحبتیں یاد آتی ہیں اور اُنکی بے ریا دوستی اور خالص محبت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرجاتا ہے جو اُنکا ذکر خیر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کبھی کسی خوش فضا مقام پر ہمارا گذر ہوتا ہے۔ اور جو لطف وہاں حاصل ہوتا ہے اُسکے بیان کرنیکا جوش ہمارے دلمیں اُٹھتا ہے۔ اسیطرح جب کوئی واقعہ ہمارے دل کو ناگوار معلوم ہوتا ہے یا کسی سے کوئی حرکت یا کام قابل نفرین ظہور میں آتا ہے تو اُسکی بُرائی ظاہر کرنیکا ارادہ ہمارے نفس میں متحرک ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ جو ملکہ اُسکی طبیعت میں خدا نے ودیعت کیا ہے اُسکو معطل اور بیکار نہ چھوڑے اور اُس سے جیسا کہ اُسکی فطرت کا مقتضیٰ ہی کچھ کام لے۔ جسطرح ایک محقق حکیم کا یہ فرض ہے کہ موجوداتِ عالم کے جسقدر خواص اور احوال اُسپر منکشف ہوں اُنسے دنیا کو آگاہ کرے یا ایک طبیب کا فرض ہی کہ عقاقیر کے مضار و منافع سے بنی نوع کو تا بمقدور بے خبر نہ رہنے دے۔ یا ایک سیاح کا فرض ہے کہ انکشافات جدیدہ سے اہل وطن کو مطلع کرے۔ اسیطرح شاعر کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ اچھّوں کی خوبیوں کو چمکائے۔ اُنکے ہنر اور فضائل عالم میں روشن کرے۔ اور اُنکے اخلاق کی خوشبو سے موجودہ اور آیندہ دونو نسلوں کے دماغ معطر کرنے کا سامان مہیا کرجائے۔ اور نیز بُرائیوں

اور عیبوں پر جہانتک ممکن ہو گرفت کرے۔ تاکہ حال و مستقبال دونو زمانوں کے لوگ برائی کی سزا اور اُسکے نتائج سے ہوشیار اور چوکنے رہیں۔ یہ وتیرہ بالکل سنت آلہی کے مطابق ہوگا کیونکہ کلام آلہی میں بھی ہمیشہ بروں کو برائی کے ساتھ اور بھلوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ متوکل باللہ نے ایک شاعر سے پوچھا کہ تم کس حد تک لوگوں کی ہجو کے درپے رہتے ہو اور کب تک اُنکی مدح و ستایش کرتے ہو؟ اُسنے کہا " مَا اَسَاؤُا وَاَحْسَنُوْا " یعنی جبتک کہ اُنسے بدی اور نیکی سرزد ہوتی ہے۔ پھر کہا۔ " نَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تَكُوْنَ كَالْعَقْرَبِ الَّتِيْ تَلْسِبُ النَّبِيَّ وَالذِّمِّيَّ " یعنی خدا نکرے کہ ہمارا حال بچھو کا سا ہو جو کہ نبی اور ذمی دونو کے ڈنک مارتا ہے۔

جب کسی ایسے شخص کی جو مدح کا مستحق ہوتا ہے تعریف کیجاتی ہے تو اُسکو مدح کا زیادہ استحقاق حاصل کرنے یا کم سے کم اپنا پہلا استحقاق قائم رکھنے کا اور دوسروں کو اُسکی ریس کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسیطرح جو لوگ نفرین کے مستحق ہیں جب اُنکے عیب کنایۃً بیان کیئے جائینگے تو امید ہے کہ وہ اس اندیشہ سے کہ مبادا آیندہ زیادہ رسوائی ہو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ یا کم سے کم اپنی برائی سے نادم یا متنبہ ہونگے اور دوسرے اُن عیبوں کو مذموم و قابل نفریں سمجھینگے۔ اسی لیئے مدح ایسے اسلوب سے کرنی چاہیئے کہ وہ منجر بہ خوشامد نہ ہو جائے۔ اور مذمت ایسے عنوان سے ہونی چاہیئے کہ دلسوزی کا پہلو طعن و تشنیع کی نسبت غالب تر ہو۔

مرثیہ بھی اس لحاظ سے کہ اُسمیں زیادہ تر شخص متوفّٰی کے محامد و فضائل بیان ہوتے ہیں

مدح کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مردوں کی تعریف کو جسمیں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں۔ عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیئے ایسے سچے اور صحیح حالات و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُنسے متوفّٰی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد بزرگوار عبدالمطلب کے مرثیئے جتنے لکھے گئے ہیں سب میں تھوڑے تھوڑے تفاوت سے اُنکی عشیرہ پروری۔ قومی ہمدردی اور قوم کی مشکلات اور مصائب میں سینہ سپر ہونے کی تعریف کی گئی ہے۔ ہر مرثیہ میں اُنکی خوبصورتی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں ممتاز۔ سربرآوردہ۔ فیاض۔ قحط سالیوں میں اہل وطن کیساتھ سلوک کرنے والے عالی خاندان۔ عہد و پیمان کے سخت پابند۔ اولوالعزم۔ نرم خو۔ صاحب رُعب و داب۔ صلۂ رحم کرنے والے۔ باحیا۔ مہالک مخاطر میں بے دھڑک گھُسنے والے اور آبرو کی حفاظت کرنے والے تھے۔ بعض مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قُصَیؔ ابن کلاب کے زمانہ سے خانہ کعبہ کی تولیت اور سقایۂ حُجّاج اور عمارت مسجد حرام عبدالمطلب کے خاندان میں چلی آتی تھی اور دیگر بنی کنانہ جو **قصی** کی نسل سے نہ تھے اسبات پر **بنی قصی** سے جلتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی قصی نے مکہ اور حوالی مکہ میں اہل وطن اور حاجیوں کے آرام کے لیئے کوئیں کھُدوائے تھے ورنہ پہلے چُقر اور گڑھے گڑھوں میں جو بارش کا پانی جمع ہو جاتا تھا۔ فقط اُسپر مدار زندگی تھا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ **ابولہب** بن عبدالمطلب کی ماں کا نام **لُبنٰی** تھا اور وہ **بنی خزاعہ** میں سے تھی۔ اور اسعد جو کہ بیس برس قوم کی حمایت میں لشکر کا سردار

رہا تھا اور ابو شمر اور عمرو بن مالک اور ذو جدن اور ابو الجبر یہ سب نبی کے رشتہ دار تھے
حذیفہ ابن غانم نے جو لوی بن غالب ہی کی نسل سے تھا عبد المطلب کے مرثیہ میں اس احسان کا
بھی ذکر کیا ہے کہ جب وہ خود چار ہزار درم قرضہ کی بابت مکہ میں پکڑا گیا تو ابو لہب بن عبد المطلب
نے اُسکو جاکر قرضخواہوں کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ اسیطرح عرب کے اکثر قصائد اور مراثی
حقایق و واقعات پر مشتمل پائے جاتے ہیں۔

ہمارے قصائد کیحالت تو ناگفتہ بہ ہے البتہ ہمارے شعرا نے مرثیہ میں ایک خاص قسم
کی نمایاں ترقی ظاہر کی ہے۔ مرثیہ کا اطلاق ہمارے ہاں زیادہ تر شہدائے کربلا اور خاصکر جناب
سید الشہدا کے مرثیہ پر ہوتا ہے۔ یہاں مرثیہ کی ابتدا اول اسی اصول پر ہوئی تھی جو کہ
قدرت نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر تعلیم کیا ہے۔ یعنی میت کو یاد کرکے حزن و غم کا اظہار کرنا
اور اپنے بیان سے دوسروں کو محزون و مغموم کرنا۔ چنانچہ جو مرثیے اول اول لکھے گئے وہ
کم و بیش بیس تیس بند یا بیس تیس بیت سے زیادہ نہوتے تھے۔ اور اُنمیں مرثیت یا بین کے سوا
اور کوئی مضمون نہوتا تھا۔ مگر چونکہ مرثیہ ایک خاص مضمون کے دائرہ میں محدود تھا اور اُسکی قدر
روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ لہٰذا متاخرین کو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدت پیدا
کریں اور اسکے مضامین میں کچھ اضافہ کریں۔ رفتہ رفتہ مرثیہ کی نَے بہت بڑھ گئی۔ یہانتک کہ
خواجہ حیدر علی آتش نے مرزا دبیر کا ایک مرثیہ مجلس میں سُنکر تعجب سے یہ کہا کہ یہ مرثیہ تھا یا الندھور
بن سعدان کی داستان تھی؟ اگرچہ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں
ایک قسم کا ایجاد تھا۔ کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہیئے تھی اُسمیں بین اور

مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح۔ فخر و مباہات۔ رزم اور بزم بھی نہایت شدّ و مد کیساتھ شامل ہوگئی۔ مگر حق یہ ہے کہ اس نئی طرز کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہوگئی۔ اس طرز میں سب سے پہلے جہانتک ہمکو معلوم ہے میر ضمیر نے مرثیے لکھے ہیں۔ گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں مگر میر انیس نے کہ باوجود خداداد مناسبت کے چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُنکے خاندان میں چلی آتی تھی اسپر اُردو زبان کے مالک تھے اور لکھنؤ بنا ہوا تھا۔ اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ اور اُردو شاعری میں جو کہ مار راک کیطرح مدت سے بے حسّ و حرکت پڑی تھی تموّج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا اگرچہ سوسائٹی کے دباؤ اور کم عیار حریفوں کے مقابلہ نے میر انیس کو ہر جگہ جادۂ استقامت پر قائم رہنے نہیں دیا بلکہ اُس دُعرپتے کیطرح جسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لیے کبھی کبھی بارہ ماسا اور چوبولے بھی الاپنے پڑتے ہیں کہیں کہیں مبالغہ و اغراق کی آندھیوں کے طوفان اُٹھانے پڑے۔ مگر اس قسم کی بے اعتدالیاں اُن فوائد کے مقابلہ میں جو اُن کی شاعری سے اُردو زبان کو پہنچے نہایت بے حقیقت اور کم وزن ہیں۔ انھوں نے بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کر دیئے۔ ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیئے ایک نیا میدان صاف کر دیا۔ اور زبان کا ایک معتدبہ حصہ جسکو ہمارے شاعروں کی قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا اُسکو شعرا سے روشناس کرا دیا۔ اُنھوں نے اپنے کلام میں جابجا اسبات کا اشارہ کیا ہے اور بالکل بجا کیا ہے کہ اُنکے ہمعصر مرثیہ گو اُنکی زبان اور طرز بیان کے خوشہ چیں تھے ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہریں رواں ہیں فیض شہ مشرقین کی　　　پیا سو ہیوہ سبیل ہے نذر حسینؑ کی

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

آج کل یوروپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اسبات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اُسنے اور شعرا سے کسقدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شایستگی سے استعمال کیئے ہیں۔ اگر ہم بھی اسیکو معیار کمال قرار دیں تو بھی **میر انیس** کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ اگرچہ **نظیر** اکبر آبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ مگر اُسکی زبان کو اہل زبان کم مانتے ہیں بخلاف میر انیس کے کہ اُسکے ہر لفظ اور ہر محاورہ کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے میر انیس کا کلام جیساکہ اوپر بیان کیا گیا بلاشبہہ مبالغہ اور اغراق سے خالی نہیں مگر اسکے ساتھ ہی جہاں کہیں وہ واقعات کا نقشہ اتارتے ہیں یا نیچرل کیفیات کی تصویر کھینچتے ہیں یا بیان میں تاثیر کا رنگ بھرتے ہیں وہاں اسبات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ مقتضائے وقت کے موافق جہاں تک کہ امکان تھا **میر انیس** نے اردو شاعری کو اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا تھا۔

شعرا کے جرگہ میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں مگر میر انیس نے اس قول کو باکل باطل کر دیا۔ اُنکو جس نظر سے کہ ہم دیکھتے ہیں اُس نظر سے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ اکثر ذاکر امام حسین علیہ السلام سمجھکر اُنکا ادب کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اُنکو صدق دل سے یا محض اپنے فریق کی پاسداری اور دوسرے فریق کی ضد سے صرف مرثیہ گویوں میں سب سے فائق اور افضل سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم ہیں جو مطلق شاعری میں اُنکو فی الواقع بے مثل سمجھتے ہوں۔

اس خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اُردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانیکا مستحق صرف انھیں لوگوں کا کلام ٹھیر سکتا ہے۔ بلکہ جس اعلےٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کیئے ہیں اُنکی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملیگی۔

فضائل اخلاق کا نمونہ اس سے اعلیٰ اور اشرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے نبیؐ کا نواسہ جسکے آگے ہر مسلمان کا سر جھکنا چاہیئے تھا۔ اور جسکو اُنسے بے انتہا اُمیدیں ہونی چاہیئیں تھیں وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔ ریگستان عرب کی لُو اور گرمی ہے۔ عورتیں صغیر سن بچے اور سارا کُنبا ہمراہ ہے۔ مدینے سے کوفہ تک مہینوں کی راہ طے کرنی ہے۔ جو اعوان و انصار بنکر ساتھ چلے تھے اُنھیں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ چھوڑ کر چل دیئے ہیں۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیجکر اور خدا اور رسول کو درمیان دیکر نصرت و یاری کے وعدوں پر بُلایا تھا۔ وہ اُنکو آکر یکقلم منحرف و برگشتہ پاتا ہے۔ اور تمام اُمیدیں مبدل بہ یاس ہوگئی ہیں۔ باانیہمہ وہ راضی برضا ہے۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے جس شخص کے تسلط کو وہ ملک اور قوم اور دین کے حق میں ایک مرض مہلک سمجھکر اُسکی بیعت سے انکار کر چکا ہے۔ باوجود ان تمام شدائد کے اپنے انکار پر اُسیطرح قایم ہے۔

دشمنوں نے کھانا اور پانی سب بند کر رکھا ہے اور دریائے فرات آنکھوں کے سامنے بہ رہا ہے۔ دشمنوں کے گھوڑے گدھے اور اونٹ تک اُس سے سیراب ہوتے ہیں مگر اُسکا

سارا کنبا تین روز سے پیاسا ہے۔ اُسکے ننھے ننھے بچے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں اور یہ سب کچھ اسلیئے ہی کہ وہ ایک نالایق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ باانیہمہ وہ اپنے ارادہ پر اُسیطرح ثابت قدم ہے۔ کسی سختی اور کسی مصیبت سے اُسکے استقلال میں فرق نہیں آتا۔

اُسکے یار و مددگار کل ستّر اور دو بہتّر آدمی ہیں۔ اور ایک ٹڈی دل سے مقابلہ ہی لڑنے میں اپنا اور سب عزیزوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ خیمہ اور اسباب کا لٹنا۔ باقیماندوں کا اسیر ہونا۔ عورتوں کی بے ردائی اور بادیہ پیمائی۔ یہ سب آفتیں گویا آنکھ سے دکھائی دیتی ہیں مگر وہ ان سب کو گوارا کرتا ہے اور بہتر سمجھتا ہے بہ نسبت اسکے کہ ایک نالایق آدمی کے ہاتھ پر بیعت کرے اور اُسکی حکومت کو تسلیم کرلے۔

وہ اپنے بھائی بیٹے بھتیجے اور بھانجوں کو نہایت اطمینان کے ساتھ مسلح اور آراستہ کرکے ایک ایک کو ہزاروں کیساتھ لڑنے کے لیئے بھیج رہا ہے۔ اُنکے بازو تلواروں سے کٹتے اُنکے کلیجے برچھیوں سے چھدتے اور اُنکی چھاتیاں تیروں سے چھنتے دیکھتا ہے۔ ایک ایک کی لاش کاندھے پر رکھکر لاتا ہے اور اپنے ہاتھ سے زمین میں دفن کرتا ہے۔ خیمہ میں عورتوں بچے کہرام سے ہر وقت ایک قیامت برپا ہے۔ بی بی۔ بیٹی اور بہنوں کی دلخراش صدائیں دلمیں ناسور ڈال رہی ہیں۔ چھ مہینے کا شیرخوار بچہ ایک بے رحم کا تیر کھاکر گود میں مرغ بسمل کیطرح تڑپ رہا ہے۔ اُسکے حلق سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آچکے ہیں اور بچہ بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب سبکے بعد اپنی باری نظر آتی ہے۔ اور پھر اہل بیت کے جہاز کا خدا کے سوا کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ ان سب بلاؤں کا سامنا ہے اور مصائب و آفات کی گھنگھور گھٹا چاروں طرف

چھائی ہوئی ہے۔ مگر انمیں سے کوئی چیز اُسکے عزم واستقلال میں تزلزل پیدا نہیں کرسکتی وہ کوہ راسخ کیطرح اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے۔ اور اپنے قول سے نہیں ہٹتا۔

وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے۔ اور نواسے کے خون کی پیاسی ہے جو چند نفوس کے مقابلہ کے لیئے ایک ٹڈی دل کو ساتھ لیکر آتے ہیں اور اپنی تمام طاقت اس بات میں صرف کررہے ہیں کہ جو ایذائیں اور تکلیفیں آدم سے تا ایندم کسی ذی روح نے کسی ذی روح کو نہیں دیں وہ سب اپنے نبیؐ کے دلبندوں اور جگر کے ٹکڑوں پر ختم کیجائیں۔ جو حرص وطمع کے نشے میں دین۔ ایمان۔ رحم۔ انصاف۔ آدمیت۔ ہمدردی اور تمام فضائل انسانی سے دست بردار ہوکر خدا کا گھر ڈھانے یعنی خاندانِ نبوّت کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے پر تیار اور کمربستہ ہیں۔ نہ وہ انکو بددعا دیتا ہے۔ نہ انکی شکایت کرتا ہے۔ نہ اُنپر غصے ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جنکے ماننے کا وہ دعوے کرتے ہیں اُنکو جتاتا ہے۔ اور اُنکے فرائض جو خاندان نبوّت کیساتھ اُنکو بجالانے چاہئیں اُنھیں یاددلاتا ہے۔

چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دلمیں یہ اُمنگ ہے کہ سب سے پہلے میں اپنی جان خاندان پر نثار کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے کہ تلواروں کی آنچ میں بھائی بھتیجے اور بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دوں۔ بھائی۔ بھائی اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو تیار اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں کی یہ تمنا ہے کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں۔ بھتیجے کی یہ آرزو ہے کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے میں ہوں۔ بہن کو یہ ارمان ہے کہ اپنے بچوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کردے۔ بھائی اس فکر میں گھلا جاتا ہے کہ اگر بھانجے میری رفاقت میں مارے گئے تو

بہن کو کیا مونہہ دکھاؤنگا۔ چچا کو خود بھی تین دن کی پیاس سے بیقرار ہے مگر اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن پیاسی بھتیجی کی بے قراری کسیطرح نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتیلی پر رکھ دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا دریا میں گھوڑا جا ڈالتا ہے۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے۔ اور پیاس کے مارے آنکھوں میں دم ہے۔ دل قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔ دو چلّو پانی میں پیاس بجھتی ہے مگر غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ ننھے ننھے بچوں کی پیاس بجھنے سے پہلے اپنی پیاس بجھالے۔ وہ مشکیزہ بھر کر اُسیطرح پیاسا دریا سے پھرتا ہے تاکہ جلد ہی جا کر بچوں کے خشک حلق میں پانی چوائے۔ لیکن دشمنوں نے گھیر کر دونو بازو کاٹ ڈالے ہیں۔ اسپر بھی اُسکو اپنے بازوں کا کچھ خیال نہیں۔ اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہے کہ مبادا پانی ضائع ہو جائے اور بچے پیاسے رہجائیں وہ سب حربے اپنے اوپر لیتا ہے مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ جب تک کہ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا۔

بی بیاں خاوندوں کو اور مائیں بیٹوں کو زخمی اور قتل ہوتے دیکھتی ہیں مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی اور مونہہ سے سانس تک نہیں نکالتی صرف اس خیال سے کہ جس مربی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں اُسکے دل پر میل نہ آئے اور وہ اپنے دل میں ہمسے محجوب نہ ہو سب اُسکی اور اُسکی اولاد کی خیر مناتی ہیں اپنے بچھڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی۔

دو صغیر سن بھائی ہیں جو صرف اس قصور پر کہ نبیؐ کے نواسے کے رشتہ دار ہیں حاکم کے حکم سے واجب القتل ٹھیرے ہیں۔ جلاد دونو کے سر پر تلوار تولے کھڑا ہے۔ بڑا بھائی منتیں کرتا ہے کہ پہلے میرا سر اُتار۔ اور چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ پہلے مجھپر وار کر۔

ایک خدا کا بندہ جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبی کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اُسکو ہرطرح دولت وجاہ ومنصب کی توقع ہے اور انکا ساتھ چھوڑنے میں جان و مال ورخاندان کی تباہی کا یقینِ واثق ہے۔ جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے وہاں کوئی ترغیب یا تقریب ایسی نہیں جو اُسکا دل ظلم و بے دردی و بے دینی اور حبّ جاہ و ثروت سے ہٹاکر رحم و ہمدردی و دینداری کیطرف مائل کرسکے۔ اُسکو ہرطرف سے یہی آواز آتی ہے کہ جلد اس قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مردوں کے سر اتاریئے۔ عورتوں اور بچوں کو اسیر کرکے لیجایئے اور حاکم سے چلکر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔ دوسریطرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا جسکے لالچ میں وہ ان تمام فائدوں سے قطع نظر کرکے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑدے بلکہ بخلاف اسکے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آتا ہے۔ باانیہمہ وہ تمام دنیوی منفعتوں اور امیدوں پر خاک ڈالکر اُن ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق کی نصرت میں اپنی جان دینے کو فوزِ عظیم جانتا ہے اور سب سے پہلے خاندانِ نبوت پر اپنی جان فدا کرتا ہے۔

چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزندِ نبی کے ہمراہ ہیں اور جو ایک ٹڈی دَل کے مقابلہ میں اسقدر قلیل ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں۔ خود اُسکے ساتھیوں اور رفیقوں کو اثنائے راہ میں اُسکا ساتھ چھوڑ چھوڑکر اور آنکھیں چرا چرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں۔ اپنے لیئے اُسکا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اُسکی رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آرہی ہے۔ نہ کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے جو اُس کی

رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو۔ مگر وفاداری کا طوق اُنکی گردن میں اور دوستی و خلاص کی زنجیر اُنکے پاؤں میں پڑی ہے۔ کوئی خوف اور کوئی طمع اُنکے اس تعلق کو قطع نہیں کرسکتی۔ صرف یہ آرزو ہے کہ کب اذنِ جنگ ملے اور کب خاندان نبوت پر اپنی جانیں قربان کریں۔ اور کب اس فرض سے سبکدوش ہوں۔

یہ چند باتیں مرثیوں کے عام بیانات سے جو کبھی کبھی کے سُنے سُنائے ہمارے ذہن میں محفوظ تھے محض سرسری طور پر استنباط کرلی گئی ہیں۔ اگر زیادہ تفحص کیا جائے تو ایسی اور بہت سی باتیں اخذ کیجاسکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک نہ صرف اُردو بلکہ فارسی و عربی شاعری میں بھی ایسی نظمیں مشکل سے ملینگی جنمیں ایسے اعلیٰ درجہ کے اخلاق بیان کیے گئے ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ جو اثر ایسی اخلاقی نظموں سے انسان کے دل پر ہونا چاہیئے وہ نہ ان مرثیوں کے سامعین کے دل پر ہوتا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اول تو یہ خیال کہ مرثیہ کا اصل مقصد صرف رونا اور رولانا ہے۔ سامعین کو دوسری طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا۔ دوسرے یہ اعتقاد کہ (جو کچھ صبر و استقلال و شجاعت و ہمدردی و وفاداری و غیرت و حمیت و عزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمام اور اُنکے عزیزوں اور دوستوں سے معرکہ کربلا میں ظاہر ہوئے وہ مافوق طاقتِ بشری اور خوارقِ عادات سے تھے) کبھی اُنکی پیروی اور اقتدا کرنیکا تصور بھی دل میں آنے نہیں دیتا۔

بہرحال ہم میر انیس کے مرثیہ کی اور نئی طرز کی مرثیہ گوئی کی دل سے داد دیتے ہیں لیکن نئی دھن کے شاعروں کو ہرگز یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں اُنکا یا اور مرثیہ گویوں کا اتباع کریں

اول تو یہ امید نہیں کہ اس خاص طرز میں اب کوئی شخص اُنکا سا کمال حاصل کرسکے۔ دوسرے مرثیہ میں رزم و بزم اور فخر و خودستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا۔ لمبی لمبی تمہیدیں اور توطئے باندھنے۔ گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں اور بعینہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے مرنے پر اظہار حزن و ملال کے لیئے سوچ سوچکر رنگین اور مسجع فقرے انشا کرے۔ اور بجاے حزن و ملال کے اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار کرے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرثیہ کی ترتیب میں مطلق فکر و غور کرنا اور صنعت شاعری سے بالکل کام لینا نہیں چاہیئے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جہانتک ممکن ہو شاعری کا سارا کمال زبان کی صفائی مضمون کی سادگی و بے تکلفی۔ کلام کے موثر بنانے اور آورد کو آمد کر دکھانے میں صرف کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ اشعار جو بے انتہا فکر و غور اور کاٹ چھانٹ کے بعد مرتب ہوئے ہیں ایسے معلوم ہوں کہ گویا بیساختہ شاعر کی قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ تیسرے مرثیہ کو صرف واقعہ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا اور تمام عمر اسی ایک مضمون کو دُھراتے رہنا اگر محض بہ نیت حصول ثواب ہو تو کچھ مضایقہ نہیں لیکن شاعری کے فرائض اس سے زیادہ وسیع ہونے چاہیئں مرثیہ کے معنی ہیں کسیکی موت پر جی کُڑھانا۔ اور اُسکے محامد و محاسن بیان کرکے اُسکا نام دنیا میں زندہ کرنا۔ پس شاعر جو کہ قوم کی زبان ہوتا ہے اُسکا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ جب کسی کی موت سے اُسکے یا اُسکی قوم یا خاندان کے دل کو فی الواقع صدمہ پہنچے۔ اُس کیفیت یا حالت کو جہاں تک ممکن ہو درد اور سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے۔ کیونکہ خالص محبت

جو ایک کو دوسرے کیساتھ ہوتی ہے۔ اور بے ریا تعظیم جو ایک۔ دوسرے کی نسبت کرتا ہے اُسکے اظہار کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ممدوح خواب عدم میں بیخبر سوتا ہو۔ اور اُس سے کسی نفع کی امید یا ضرر کا خوف باقی نہ رہا ہو۔ اب اگر شاعر کا دل فی الحقیقۃ علایق دنیوی سے ایسا پاک ہی کہ مقربانِ درگاہِ آلہی کے سوا کسی کی موت سے متاثر او متغیر نہیں ہوتا۔ اُسکو آحاد ناس کے مرثیے لکھنے کی تکلیف دینی بلاشبہہ تکلیف مالا یُطاق ہوگی۔ لیکن اگر اُسکے پہلو میں ایسا پاک دل نہیں ہی بلکہ وہ عام انسانوں کیساتھ ہمدردی رکھتا ہے اور دنیاداروں کی موت پر بھی اُسکا دل پسیجتا ہے تو اُسکو اپنی فطرت کا مقتضیٰ ضرور پورا کرنا چاہیے۔

یہ سچ ہے کہ جناب سید الشہدا اور اُنکے عزیزوں اور ساتھیوں کے آلام و مصائب کا بیان بشرطیکہ اُسمیں بناوٹ اور تصنع اور صنعت شاعری کا اظہار نہو ایک مسلمان کے ایمان کو تازہ کرتا ہے۔ اور اُس سے خاندان نبوت کیساتھ رشتۂ محبت و اخلاص جو کہ اسلام کی جڑ ہے مضبوط ہوتا ہے۔ اور اُنکے بے نظیر صبر و استقلال کی پیروی کرنیکا سبق حاصل ہوتا ہے لیکن جسطرح ان تمام باتوں کی ضرورت ہی اسیطرح قوم میں قومیّت کی روح پھونکنے کی بھی ضرورت ہے اور وہ اسیطرح پھونکی جاتی ہے کہ قوم کے افراد مثل ایک خاندان کے ممبروں کے ایک دوسرے کیساتھ ہمدردی کریں۔ اُنکی مساعی جمیلہ کی قدر کریں۔ اُنکے نیک کاموں میں معین و مددگار ہوں زندگی میں اُنکی نیکیوں کو چمکائیں۔ اُنکے کمالات کو شہرت دیں۔ اور مرنے کے بعد اُن کی ایسی یادگاریں قائم کریں جو صفحۂ ہستی سے کبھی مٹنے والی نہوں۔ مدحیہ قصیدے جو ممدوح کی زندگی میں لکھے جاتے ہیں اُنمیں اُسکی خوبیوں کا ایسا ثبوت نہیں ہوتا جیسا کہ اُسکے مرنے کے بعد

بے لاگ مرثیوں اور نوحوں میں ہوتا ہے۔ اسیواسطے ہمارے قدیم شعرا جنکا خمیر عرب کی خاک پاک سے تھا جب کوئی برگزیدہ آدمی قوم میں سے اُٹھ جاتا تھا اُسکے مرثیئے ویسے ہی شوق اور جوش وخروش کیساتھ لکھتے تھے جیسے کہ اُسکی زندگی میں مدحیہ قصیدے انشا کرتے تھے۔ برامکہ کے مرثیوں پر شعرا برابر قتل کیے جاتے تھے۔ مگر لوگ اُنکے مرثیئے لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ معن بن زائدہ کا مرثیہ لکھنے پر خلیفۂ وقت نے ایک شاعر کو کمال بیحرمتی کیساتھ دربار سے نکلوا دیا۔ اسپر بھی اُسکے بیشمار مرثیئے لکھے گئے۔ ابو اسحاق صابی کا مرثیہ علم الہدےٰ شریف مرتضیٰ نے باوجود اختلافِ مذہب کے ایسے سوز و گداز کے ساتھ لکھا ہے جیسے کوئی اپنے عزیز و یگانے کی موت پر افسوس کرتا ہے اور اُسکے علم و فضل کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ اسیطرح ہزارہا مرثیہ اہل علم اہل کمال بہادروں۔ فیاضوں۔ نیکدل بادشاہوں۔ لائق وزیروں اور دیگر ممتاز لوگوں کی وفات پر لکھا گیا ہے۔

لیکن جو شخص **مرثیہ** لکھنے میں کمال حاصل کرنا چاہے۔ اُسکے لیئے اس نئی طرز کے مرثیہ سے بہتر کوئی رہنما اُردو شاعری میں نہیں ملسکتا۔ جو باتیں ان بزرگوں کے کلام میں مرثیّت کی شان کے برخلاف ہیں اگر اُنسے قطع نظر کیجائے تو طالبِ فن کو اُس سے نہایت عمدہ سبق ملسکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ **قصیدہ** اول تو اردو میں بمقابلہ فارسی اور عربی کے اسقدر کم لکھا گیا ہے کہ گویا بالکل نہیں لکھا گیا۔ دوسرے اُسکا کوئی نمونہ اُردو میں ایسا نشان نہیں دیا جاسکتا جسکے قدم بہ قدم چلنا چاہیئے۔ اول سودا اور آخر ذوق صرف یہ دو شخص ہیں جنھوں نے ایران کے قصیدہ گویوں کی روش پر کم و بیش قصیدے

لکھے ہیں۔ اور جو چال قدیم سے چلی آتی تھی اُسکو بہت خوبی سے نباہا ہے۔ مگر جیسے قصیدے کی اب ضرورت ہے یا آئندہ ہونے والی ہے یا ہونی چاہیئے اُسکا نمونہ ہماری زبان میں معدوم ہے شاید بہت تلاش سے عربی میں کسیقدر زیادہ اور فارسی میں خال خال ایسے نمونے ملیں جنکا اتباع کیا جا سکے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایشیاٹک پوئیٹری میں ایسے نمونے تلاش کرنے جنپر آجکل کے خیالات کے موافق مدح یا ہجا کی بنیاد قائم کیجائے بعینہ ایسی بات ہے جیسے ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کی رعایا میں آزادی رائے کی جستجو کرنی۔ جن ملکوں میں ابتداے آفرینش سے بادشاہوں اور اُنکے ارکان سلطنت کی برابر پرستش ہوتی رہی ہو۔ جہاں رعیت کی سلامتی بلکہ زندگی خوشامد اور فرمانبرداری اور رضا و تسلیم پر موقوف ہو۔ جہاں رعیت اور غلام دو مترادف لفظ سمجھے جاتے ہوں۔ اور جہاں آزادی ایک ایسا لفظ ہو جسکے مفہوم سے کوئی واقف تک نہو ایسے ملکوں میں ممکن نہیں کہ مدح و ذم کے اصول راستی و عقل و انصاف پر مبنی ہوں پس اسکے سوا کچھ چارہ نہیں کہ مدح و ذم کا طریقہ یوروپ کی موجودہ شاعری سے اخذ کیا جائے۔ اور آیندہ قصائد کی بنیاد اسی طریقہ پر رکھی جائے۔

مثنوی

مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہے کیونکہ **غزل** یا **قصیدہ** میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ **مسدس** میں یہ دقت ہے کہ ہر بند میں چار قافیے ایک طرح کے اور دو ایک طرح کے لانے پڑتے ہیں۔ پس اُس میں مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرنے کہ مطالب برابر بے کم و کاست ادا ہوتے چلے جائیں

اور قافیوں کی نشست اور روزمرہ کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ جائے ہر شخص کا کام نہیں ہے **ترجیع بند** بھی مسلسل مضامین کی گوں نہیں ہے۔ کیونکہ اُسمیں ہر بند کے آخر وہی ایک ترجیع کا شعر بار بار آتا ہے جو سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیتا ہے **ترکیب بند** کے اگر تمام بندوں میں بیتوں کی تعداد برابر رکھی جائے تو بھی ایسی ہی دقت پیش آتی ہے کیونکہ اُسکے ایک بند میں صرف ایک پوائنٹ عمدگی سے بیان ہو سکتا ہے۔ لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی بلکہ کم و بیش ہوتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ بند بھی چھوٹے بڑے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک بند دو تین بیت کا ہو اور دوسرا پندرہ بیس بیت کا۔ اور یہ بات اُس تناسب کے برخلاف ہے جو شعر کا جزو اعظم ہے۔

الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اُردو شاعری میں متداول ہیں۔ اُن میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دیجا سکتی ہے۔ عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں ظاہرا ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جا سکی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں۔ اسی لیئے عرب شاہنامہ کو قرآن العجم کہتے ہیں۔ اور اسی لیئے مثنوی معنوی کی نسبت "ہست قرآں در زبان پہلوی" کہا گیا ہے۔

اُردو میں چند چھوٹی چھوٹی عشقیہ مثنویوں کے سوا اخلاق یا تاریخ وغیرہ میں ظاہرا آج تک کوئی چھوٹی یا بڑی مثنوی کسی مسلم الثبوت اُستاد نے نہیں لکھی۔ عشقیہ مثنویوں کا

حال بھی جیساکہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں اس زمانہ کے مقتضٰے اور مذاق سے بمراحل دورتر اور بعید تر ہے۔ جو قصے ان مثنویوں میں بیان کیے گئے ہیں اُن میں قطع نظر اسکے کہ ناممکن اور فوق العادۃ باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے۔ اکثر مثنویوں میں شاعری کے فرائض بھی پورے پورے ادا نہیں ہوئے۔ مثنوی میں علاوہ اُن فرائض کے جو غزل یا قصیدے میں واجب الادا ہیں کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کی مراعات نہایت ضروری ہے ازانجملہ ایک ربط کلام ہے جو کہ مثنوی اور ہر مسلسل نظم کی جان ہے۔ غزل اور قصیدہ میں ایک شعر کو دوسرے شعر سے جیساکہ ظاہر ہے کچھ ربط نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ۔ بخلاف مثنوی کے کہ اُس میں ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہیئے جیسے زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے۔ اسی لیئے جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے اُن سے مثنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں ہوسکتے۔ باورچیوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ پتیلی پکانے والے سے دیگ اچھی نہیں پک سکتی۔ جو نسبت پتیلی کو دیگ کے ساتھ ہے وہی نسبت غزل کو مثنوی کے ساتھ ہے۔ جسطرح پتیلی پکانے والے کو دیگ کے نمک پانی اور آنچ کا اندازہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ اسیطرح جو لوگ غزل میں منہمک ہوجاتے ہیں اور اُن پر غزلیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے وہ مثنوی کی ترتیب اور انتظام سے اکثر عہدہ برآ نہیں ہوتے۔

جس نظم میں کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی فرضی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اُس میں مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ

مطالب ایسی صفائی سے ادا کیے جائیں کہ اگر انھیں مطالب کو نثر میں بیان کیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ واضح اور صاف اور مربوط نہو۔ البتہ نظم کا بیان نثر سے صرف اسقدر ممتاز ہونا چاہیئے کہ نظم کی طرز بیان نثر سے زیادہ مؤثر اور دلکش و دلاویز ہو۔

پس مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے۔ اور دونو کے بیچ میں کہیں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت مقدر نہ مانی جائے تب تک کلام جیسا کہ چاہیئے مربوط اور منتظم نہ ہو مثلاً **گلزار نسیم** میں کہتا ہے

"خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے"

"پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکیگا کسی کو"

جو مطلب کہ صاحب مثنوی ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ "لوگ تو اُس طفلِ مہ جبیں کو دیکھکر خوش ہوتے تھے مگر نجومیوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ یہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اسکو دیکھکر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیگا کیونکہ اسکو دیکھتے ہی بینائی جاتی رہیگی" ظاہر ہے کہ ان دونو بیتوں میں جب تک کہ کئی لفظ بڑھائے اور کئی لفظ بدلے نہ جائیں تب تک یہ مطلب جو ہمنے اوپر بیان کیا ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا۔ اور پہلا مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہو سکتا۔ یا مثلاً اسی مثنوی میں ہے۔

"نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو چشمک تھی نصیب اُس پدر کو"

مطلب یہ ہے کہ بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے۔ مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے لیے ظلمت تھا۔ پس جب تک دوسرے مصرع کے الفاظ بدلے نہ جائیں کلام مربوط نہیں ہو سکتا۔ مثلاً

"آتا تھا شکارگاہ سے شاہ نظارہ کیا پدر نے ناگاہ"

یہ دونو مصرعے بھی مربوط نہیں ہیں۔ کیونکہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شاہ اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے۔ حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ پس دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیئے "بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ"۔

۱۔ بہرحال مثنوی میں ربط کلام کا لحاظ رکھنا خاصکر جب کہ اُسمیں تاریخ یا قصہ بیان کیا جائے نہایت ضرور ہے۔

۲۔ دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اُسکی بنیاد ناممکن اور فوق العادۃ باتوں پر نہ رکھی جائے۔ اگرچہ قصوں اور کہانیوں میں ایسی باتیں بیان کرنے کا دستور نہ صرف ایشیا میں بلکہ کم و بیش تمام دنیا میں قدیم سے چلا آتا ہے اور جب تک کہ انسان کا علم محدود تھا ایسی باتوں کا اثر لوگوں کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن اب علم نے اُس طلسم کو توڑ دیا ہے۔ اب بجائے اسکے کہ اُن باتوں کا لوگوں کے دل پر کچھ اثر ہو اور اُنپر ہنسی آتی ہے اور اُنکی حقارت کیجاتی ہے اور بعوض اسکے کہ اُنسے کچھ تعجب پیدا ہو شاعر کی حماقت اور سادہ لوحی معلوم ہوتی ہے۔ اب شاعر یا ناولسٹ کی لیاقت اِس سے ثابت ہوتی ہے کہ جو مرحلے پہلے محالات کے ذریعہ سے طے کیے جاتے تھے اور جن کا عادۃً طے ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا اُنکو علم اور فلسفہ کے موافق نہایت آسانی

کے ساتھ طے کر جائے۔ مثلاً **شاہنامہ** میں جہاں رستم اور سہراب کو لڑایا ہے
وہاں فردوسی یا اصل قصہ بنانے والے کو دو متضاد باتیں ثابت کرنی منظور ہیں۔ ایک سہراب
کا رستم سے بہت زیادہ قوی اور تنومند ہونا۔ دوسرے رستم کے ہاتھ سے آخرکار اُسکو قتل
کرانا۔ پہلی بات تو اُسنے اسطرح ثابت کی ہے کہ پہلے مقابلہ میں سہراب نے رستم کو پچھڑوایا ہے
مگر اب دوسری بات بغیر اسکے ثابت نہیں ہوسکتی کہ رستم میں غیر معمولی طاقت خودبخود پیدا
ہوجائے۔ پس اس غرض کے لیئے یہ بات گھڑی گئی کہ رستم نے جوانی میں جبکہ وہ اپنی طاقت
اور زور سے تنگ آگیا تھا خدا سے دعا کی تھی کہ میری طاقت کم ہوجائے۔ چنانچہ اُسکی اصلی طاقت
بہت کم ہوگئی تھی۔ اب سہراب سے مغلوب ہوکر اُسنے پھر دعا کی کہ میری اصلی طاقت مجھکو ملجائے
چنانچہ اُسکی اصلی طاقت جو خدا کے ہاں امانت رکھی تھی اُسکو واپس مل گئی اور دوسرے یا تیسرے
مقابلہ میں وہ سہراب پر غالب آگیا۔ لیکن اس زمانہ میں ایسے ڈھکوسلوں سے کچھ کام نہیں چلتا
آج کل کسی کو ایسا مرحلہ پیش آئے تو وہ اُسکو اسطرح طے کرسکتا ہے کہ رستم جو کسی سے مغلوب
نہ ہوا تھا اور جسکی شہرت تمام ایران اور توران میں ضرب المثل تھی۔ ایک لونڈے کے ہاتھ سے
پچھڑکر اُسکی غیرت سخت جوش میں آئی اور اپنی عمر بھر کی ناموری اور عزت قائم رکھنے کا ولولہ
اُسکے دل میں نہایت زور کے ساتھ متحرک ہوا۔ گو وہ طاقت میں سہراب سے بہت کم تھا مگر سپہگری
کے کرتبوں اور تجربوں میں سہراب کو اُس سے کچھ نسبت نہ تھی۔ لہٰذا دوسرے یا تیسرے مقابلہ
میں جوش غیرت اور پاس عزت اور فن سپہگری کی مشاقی سے اُسنے سہراب کو مار رکھا۔
رہی یہ بات کہ اخلاقی مضامین جو اکثر قدیم زمانہ کے نامور شعرا نے سوپیرایوں اور ہاتوں کے

پیرایہ میں بیان کیئے ہیں یا اب شائستہ ملکوں میں بیان کرتے ہیں یہ ایک دوسرا عالم ہی انکا مطلب ایسے پیرائے اختیار کرنے سے اخلاقی نتائج نکالنے اور کلام کو تعجب انگیز کرکے اُس میں اثر پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ ناممکن باتوں کا لوگوں کو یقین دلانا اور اُن کو واقعات کا لباس پہنانا یہ بالکل ایسی ہی بات ہو کہ ایک شخص جانوروں کے پیرایہ میں خصائل انسانی ظاہر کرتا ہے۔ اور اُن سے اخلاقی نتائج استخراج کرتا ہے اور دوسرا شخص بغیر اس مقصد کے جانوروں کی حکایتیں سطرح بیان کرتا ہے کہ گویا وہ اُن میں فی الواقع تمام خصائل انسانی ثابت کرنا اور لوگوں کو اُنکا یقین دلانا چاہتا ہے۔ اسمیں اور اُسمیں بہت بڑا فرق ہے۔ پس ایسے بے سروپا قصے لکھنے سے خاصکر اس زمانہ میں اجتناب کرنا چاہیئے۔

۳۔ مبالغہ کو اہل بلاغت نے صنائع معنوی اور محسّنات کلام میں شمار کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اُس کی لَے بڑھتے بڑھتے اب وہ اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ کلام کو بے قدر و سبک اور کم وزن کردیتا ہے۔ انتہا سے انتہا درجہ کا مبالغہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے کہ جو کچھ کسی چیز کی تعریف یا مدح یا ذم میں کہا جائے گو وہ اُس چیز کے حق میں صحیح نہ ہو مگر کسی نہ کسی چیز پر صادق آسکتا ہو۔ نہ یہ کہ دنیا میں کوئی چیز اُسکی مصداق نہ ہو۔ اور مبالغہ کی غایت یہ ہونی چاہیئے کہ جو مطلب بیان کرنا منظور ہے مبالغہ کے سبب سے اُسکا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہو۔ نہ یہ کہ اُسکا رہا سہا یقین بھی جاتا رہے۔ مثلاً کسی پر رونق بازار کی نسبت ایک تو یہ کہنا کہ "وہاں صبح سے شام تک کٹورا بجتا ہے" (اگرچہ وہاں کسی وقت بھی کٹورا نہ بجتا ہو) اور ایک اُسکی تعریف اسطرح کرنی۔

"رات دن جمگھٹا ہے میلا ہے مہرومہ کا کٹورا بجتا ہے"

یا مثلاً ایسے بازار کی نسبت ایک تو یہ کہنا کہ "وہاں چھڑکاؤ سے ہر وقت زمین نم رہتی ہے" اور ایک یہ کہ "وہاں گلاب اور کیوڑے کا نہیں بلکہ آب گوہر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے" پس آج کل ایسے مبالغے باعث شرم سمجھے جاتے ہیں، اور بجائے اسکے کہ اُنسے سامع کے دل پر کوئی نقش بیٹھے یا شاعر کی لیاقت ظاہر ہو اُسکی لغویت اور بے سلیقگی پائی جاتی ہے۔

۴۔ مقتضائے حال کے موافق کلام ایراد کرنا خاصکر قصہ کے بیان میں ایسا ضروری ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بلاغت کا بھید صرف اسی بات میں چھپا ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت وسیع بحث ہے مگر ہم یہاں صرف چند مثالیں دیکر اس مطلب کو ناظرین کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔

مثلاً مثنوی طلسم الفت میں اُس موقع پر جب کہ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے شیدا وزیر اپنے شہزادہ کے لیئے نسبت کا پیغام لیکر شہر حسن آباد میں شاہانہ جاہ و حشم کے ساتھ پہنچا ہے اور حسن آباد کے بادشاہ نے اُسکے آنے کی خبر سُنکر اپنے وزیر کو اُس سے گفتگو کرنے کے لیئے بھیجا ہے وہاں صاحب مثنوی اسطرح بیان کرتا ہے۔

جاتے ہی اُسنے قرب شہر پناہ خیمہ اپنا کیا بہ شوکت و جاہ
بسکہ دانائے روزگار تھا وہ مرد میدان کارزار تھا وہ
رُعب پہلے ہی سے بٹھانے کو صولت و دبدبہ دکھانے کو
کی اُسی روز لشکر آرائی کثرتِ فوج سب کو دکھلائی

خبر آمد کی اُسکی عام ہوئی — خلق دہشت زدہ تمام ہوئی
اتنے میں وھاں کے شہریار کو بھی — خبر اُسکے ورود کی گذری
کہ کسی شہر کا کوئی سردار — لیکے ہمراہ لشکر بسیار
آکے اُترا ہے قرب شہر پناہ — مستعد جنگ پہ ہے وہ ذی جاہ
سنتے ہی وہ کمال گھبرایا — وزرا کو بُلا کے فرمایا
دیکھو تو کس کا لشکر اُترا ہے — کون ہم پر غنیم آیا ہے
الغرض اک وزیر با تدبیر — اپنی ہمراہ لیکے فوج کثیر
تھا فروکش جہاں وہ ہم پایہ — وھاں ملاقات کے لیئے آیا
سنتے ہی پاس یہ کیا اُس نے — بے تکلف بُلا لیا اُس نے
تا لب فرش لینے کو آیا — ملکے پہلو میں اپنے بٹھلایا
پہلے تو ذکر ادھر اُدھر کا رہا — بعد اک طور سے یہ اُسنے کہا
کہ جہاں دار جو ہمارا ہے — اُس فلک قدر نے یہ پوچھا ہے
آپنے کی ہے کیوں ادھر تکلیف — کس ارادہ سے لائے ہیں تشریف
سیر کا عزم ہے تو گھر ہے یہ — ہر مسافر کا رہگذر ہے یہ
دل میں گر اور کچھ ارادہ ہو — تو میں باہر نہیں ابھی آؤ
فقط اتنی ہی دیکھتا تھا میں راہ — دیر پھر کس لیئے ہے بسم اللہ

اس بیان میں قطع نظر لفظی کمزوریوں کے بڑی کسر یہی ہے کہ کلام مقتضائے حال کے موافق

ایراد نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے بیان میں مؤرخ خود واقعات کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ اور قصہ میں واقعات اُسکے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ تاریخ میں جس واقعہ کی صحت بخوبی ثابت ہوجائے اُس کی جواب دہی مؤرخ کے ذمہ باقی نہیں رہتی البتہ اُسکا یہ فرض ہے کہ اُسکے اسباب کا تفحص کرے اور بتائے کہ کیوں ایسا واقع ہوا۔ بخلاف قصہ کے کہ اُسکے بیان میں جو بے ربطی پائی جائے گی اُسکا ذمہ دار خود قصہ کا بنانے والا ہے۔ اول تو نسبت کے پیغام کو پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سے طے نہ کرنا اور دفعۃً وزیر اور شاہزادہ کے ساتھ ایک لشکر جرار روانہ کر دینا۔ پھر وزیر کا فوج کشیر لیکر اور مہینوں کا رستہ طے کر کے حسن آباد کی شہر پناہ تک پہنچ جانا۔ اور بادشاہ حسن آباد کو اُسکے حال اور اُسکے ارادہ کی مطلق خبر نہ ہونی پھر اُسکا حال دریافت کرنے کے لیئے بادشاہ کا وزیر کو مع فوج کثیر کے بھیجنا۔ پھر وزیر کا بادشاہ کی طرف سے مہمان کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جیسی کہ بازاریوں میں ہوتی ہے یعنی یہ ” اگر کچھ اور ارادہ ہو تو میں اُس سے بھی باہر نہیں ہوں میں بس اتنی ہی راہ دیکھتا تھا اب دیر کیا ہے بسم اللہ “ بالکل مقتضائے مقام کے خلاف ہے۔

اسکے بعد **شیدا** وزیر۔ بادشاہ عشق آباد کی طرف سے نسبت کا پیغام دینے کے بعد کہتا ہے

جاہ و حشمت کا کچھ اگر ہو خیال — تو یہ بیجا ہے اے ہمایوں فال
آپ ہیں اپنے شہر کے سلطاں — بندہ ہے تاج بخش باج ستاں
دل میں انصاف کیجئے تو صریح — ہر طرح سے ہے بندہ کو ترجیح

کہ میں سلطان خسرواں ہوں آج ‏ بلکہ شاہنشہِ جہاں ہوں آج
میرے قبضے میں ہیں کئی اقلیم ‏ بخشتا ہوں میں افسر و دیہیم
مجھکو دی ہے خدا نے وہ طاقت ‏ وہ مراد بدبہ ہے اور صولت
آج چاہوں تو باج دے قارون ‏ ربعِ مسکوں پہ سکہ بٹھلاؤں
زور دکھلانے پر میں آؤں اگر ‏ چھین لوں تاج خسروِ خاور
ہیں دلاور وہ ہوں وہ ہوں سفاک ‏ ہفت اقلیم میں ہے جسکی دھاک
سرکش آآکے پاؤں پڑتے ہیں ‏ ناک در پر مرے رگڑتے ہیں

اس بیان کی بے ربطی بھی ظاہر ہے کہ وزیر نے جس بادشاہ کی طرف سے نسبت کا پیغام دیا ہے اور جسکا منصب عجز و انکسار کرنے کا ہے۔ اُسکی طرف سے ایسی نامعقول گیدڑ بھبکیاں دیتا ہے اسکے بعد جب وزیرِ حسن آباد شیدا کی تقریر سنکر اپنے بادشاہ کے پاس واپس گیا ہے اور وھاں جاکر اُسنے شیدا کی تقریر کا اعادہ کیا ہے تو بادشاہِ حسن آباد اُسکے جواب میں کہتا ہے۔

ہاں کہو جلد فوج ہو تیار ‏ ما بدولت کے لاؤ تو ہتھیار
دیکھیں تو کتنا حوصلہ ہے اسے ‏ ہمسے عزمِ مقابلہ ہے اسے
لوہا دکھلانے کو یہ آیا ہے ‏ ہمکو کیا موم کا بنایا ہے
بادشاہ اسکا کیا ہے یہ کیا ہے ‏ کثرتِ فوج پر یہ بھولا ہے

یہ تمام تقریر ایسی سبک اور کم وزن ہے کہ ہرگز کسی بادشاہ کے مونہ سے زیب نہیں دیتی۔ بلکہ

یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بادشاہ کی حماقت ظاہر کرنے کے لیئے کوئی شخص اُسکی نقل اُتار رہا ہی۔ پھر جب امیروں نے بادشاہ کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا ہے تو وزیر بادشاہ کی طرف سے **شیدا** کے پاس یہ مصالحت آمیز پیغام لیکر چلا ہے۔

یہ تعلی جو آپ کرتے ہیں — اتنا جرأت کا دم جو بھرتے ہیں
سابقہ ہو تو حال کُھل جائے — ادھر آؤ تو حال کُھل جائے
گو کہ میں تم سا خود پسند نہیں — سیکڑوں سے بھی پر میں بند نہیں
سر بھی جائے تو یہ قدم نہ ہٹیں — ٹل بھی جائے زمیں تو ہم نہ ہٹیں
یہاں تو رستم سے بھی نہیں ڈرتے — شیر سے بھی جری نہیں ڈرتے
کیا کروں پاس ہے شریعت کا — دھیان ہے دوستی و الفت کا
شرم ہے مہماں کے آنے کی — رسم بھی ہے یہی زمانے کی
ورنہ سیر آپ کو دکھا دیتا — سب گھمنڈ آپ کا مٹا دیتا

یہاں تک خود بادشاہ کا پیغام بادشاہ کی طرف ہی۔ ان تمام ابیات میں الفاظ و محاورات کی لغزشوں سے ہم کچھ بحث نہیں کرتے۔ البتہ ہکو یہ دکھانا منظور ہے کہ کلام بالکل مقتضائے حال کے برخلاف ایراد کیا گیا ہے۔ اسی داستان پر کچھ موقوف نہیں ہے۔ اس مثنوی میں کہیں بھی اس بات کا خیال نہیں کیا گیا کہ جیسا موقع ہو ویسی گفتگو کیجائے۔ اس داستان سے پہلے جہاں بادشاہِ حُسن آباد اور اُسکی بڑھیا ملکہ بیٹیوں کے عقد کے باب میں باہم مشورہ کر رہے ہیں اسطرح بیان کرتا ہے۔

ایک دن بادشاہِ حسن آباد ــــ اندرونِ محل تھا با دلِ شاد
اپنی بی بی سے گرمِ خلوت تھا ــــ محوِ راحت تھا مستِ عشرت تھا
اُس پہ پیرو نے تخلیہ پاکر ــــ عرض کی اختلاط میں آکر
لڑکیوں کا نہیں کچھ آپکو دھیاں ــــ ہو چکی ہیں سلامتی سے جواں
اور باتوں کا تو نہیں کچھ غم ــــ ہاں مگر یہ خیال ہے ہر دم
کہ میں بیٹھی ہوئی ہوں پا بہ رکاب ــــ طاقتِ جسم دے چکی ہے جواب
سب مہیا ہیں کوچ کے ساماں ــــ اَور دو چار دن کی ہوں مہماں
کچھ ہی دن اب سفر میں باقی ہیں ــــ انکا سہرا تو دیکھ لیستی میں
سن کے کہنے لگا وہ عالی جاہ ــــ تیرے کہنے ہی تک ہے کیا اے ماہ
بخدا خود خیال ہے مجھکو ــــ جستجو بھی کمال ہے مجھکو
مجھکو غیروں میں تو قبول نہیں ــــ اُنسے جز رنج کچھ حصول نہیں
یہ بھی بالفرض گر کروں منظور ــــ تو یہ مجھسے کبھی نہ ہووے اے حور

اس تقریر میں بھی اکثر الفاظ بالکل بے محل اور بے موقع استعمال ہوئے ہیں۔ بادشاہ خود شیخ فانی ہے اور اُسکی ملکہ بھی عجوز سالخوردہ ہے۔ وہ خود جا بجا کہتی ہے کہ میں پا در رکاب بیٹھی ہوں۔ اور چناں ہوں اور چنیں ہوں۔ باوجود اسکے ایسے الفاظ استعمال کرنے کہ "اپنی بی بی سے گرم خلوت تھا یا محو راحت اور مستِ عشرت تھا۔ یا اُس پہ پیرو یعنی بڑھیا نے اختلاط میں آکر عرض کی۔ یا بادشاہ کا اپنی بُڑھیا ملکہ کو کہیں اے ماہ اور کہیں اے حور کہنا یہ سب باتیں

مقتضائے حال کے خلاف ہیں۔

ایک جگہ جب کہ شاہزادہ کو غش آگیا ہے اور یہی بڑھیا ملکہ جو اُسکی ماں ہے محل کے اندر گھبرا رہی ہے۔ اور بار بار اُس کی خبر باہر سے منگواتی ہے۔ ایک خواص باہر سے یہ کہتی آئی ہے۔

"لوگو بتلاؤ تو کہاں ہیں حضور کہہ دو کیا بیٹھی کرتی ہو اے حور"

پھر تھوڑی دیر کے بعد اَور نوکریں آکر یہ کہتی ہیں۔

"دوڑ سی دوڑ ہو رہی ہے حضور باہر اندر یہی ہے ذکر اے حور"

دونو جگہ ایک مصرع میں ملکہ سالخورد کو حضور اور دوسرے مصرع میں اے حور کہنا اور پھر نوکروں کا اور وہ بھی نہایت تشویش کی حالت میں کہنا بالکل مقتضائے حال کے خلاف ہے۔

نواب مرزا شوق لکھنوی نے جو چار مثنویاں یعنی بہار عشق۔ زہر عشق۔ لذت عشق اور فریب عشق لکھی ہیں۔ اگرچہ اُنکو روزمرہ اور محاورہ کی صفائی۔ قافیوں کی نشست۔ ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے میں تمام اُردو کی موجودہ مثنویوں سے بہتر سمجھتا ہوں لیکن قطع نظر اسکے کہ وہ حد سے زیادہ امورال اور خلاف تہذیب ہیں۔ اُن میں بھی مقتضائے حال کے موافق ایرادِ کلام کا بہت کم لحاظ کیا گیا ہے۔ مثلاً **لذت عشق** میں اُس موقع پر جہاں بادشاہزادہ اور وزیرزادہ اپنے ساتھ والوں سے بچھڑ کر کسی باغ میں دم لینے کو ٹھیرے ہیں اور رستے کی تکان سے ایک چبوترہ پر پڑ کے سو رہے ہیں وہاں اُس شہر کی ہزادی جو باغ کی مالک ہی اور اُسکے ساتھ وزیرزادی دونو باغ کی سیر کو آئی ہیں اور اُن دونو

سوتوں کے سر پہ جا کھڑی ہوئی ہیں۔ اور ایسے قہقہے لگائے ہیں کہ وہ جاگ اُٹھے ہیں۔ اُسوقت شاہزادہ نے جو دیکھا کہ شام ہوگئی ہے وہ وہاں سے چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور بادشاہزادی اُس سے اسطرح گفتگو کرتی ہے۔

کہا ہنسکے ملکہ نے اے مہ جبیں مجھے تیری فرقت گوارا نہیں
مرا کہنا اس وقت کا مان لے نہیں جان دیدوں گی یہ جان لے
خدارا نہ ٹالو مری بات کو یہیں آج رہ جاؤ اب رات کو

اسکے بعد وزیرزادہ ملکہ سے کہتا ہے کہ اگر آپ میری اک عرض قبول کرلیں تو نہ میں قدموں سے جدا ہوں گا اور نہ شاہزادہ یہانسے جائے گا۔ اسکے بعد کہتا ہے۔

کھڑی ہے جو یہ پاس دختِ وزیر حقیقت میں ہے یہ نہایت شریر
انیلاپن اس کا مجھے بھا گیا کروں کیا دل اسپر مرا آ گیا
مجھے اسکو دیدیجئے گر حضور تو ساری جوانمردگی ہو جائے دور

یہ سنکر دختِ وزیر۔ وزیرزادہ سے کہتی ہے۔

سمجھنا نہ دل میں ذرا مجھکو نیک سُناؤں گی سو گر کہے گا تو ایک
نہ ملکہ کی باتوں پہ مغرور ہو ہوا کھا ذرا چل پرے دور ہو
ذرا ہوش کی لے تو اپنے خبر میں جوتی نہ ماروں ترے نام پر

اول تو عورت ذات۔ دوسرے بادشاہزادی۔ پھر پہلی ملاقات۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ شاہزادہ پر مائل ہوگئی ہے اور اُسکو اپنے اوپر مائل کرنا چاہتی ہے۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ وہ

بیسوا ہی ہے تو بھی اُسکی گفتگو ایک محض اجنبی مرد کے ساتھ ایسی کُھلی ڈُلی اور بے حجابانہ یا شوق کا اظہار ایسے تقاضے کے ساتھ کہ جس سے دوسرے کو نفرت ہو جائے کسقدر بے محل اور بے موقع ہے۔ پھر وزیرزادہ کی پہلی ہی گفتگو دختِ وزیر کی نسبت ایسی عامیانہ اور عشق کا اظہار ایسے بھونڈے پن کے ساتھ۔ اور پھر دُختِ وزیر کا پَنْخِنیوں کی طرح جواب دینا یہ تمام باتیں بلاغت کے بالکل خلاف ہیں۔ میر حسن نے بدرمنیر میں بعینہ ایسے ہی موقع پر یعنی جبکہ پہلے ہی پہل بے نظیر۔ بدرمنیر کے باغ میں آیا ہے اور بدرمنیر اُسکو دیکھکر فریفتہ ہو گئی ہے۔ یوں بیان کیا ہے۔

کہ وہ نازنیں کچھ جھجک مونہ چھپا ‍ ‍ کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
چلی اُسکے آگے سے مونہ موڑکر ‍ ‍ وہیں نیم بسمل اُسے چھوڑ کر
ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی ‍ ‍ چھپا مونہ کو اور مسکراتی چلی
"یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں ‍ ‍ میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں"
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں ‍ ‍ چھپی جاکے اپنے وہ دالان میں
دیا ہاتھ سے چھوڑ پردہ شتاب ‍ ‍ چھپا ابر تاریک میں آفتاب

اس بیان میں شوق کے بیان کی نسبت موقع اور محل کا جیساکہ ظاہر ہے زیادہ خیال کیا گیا ہی۔ اسکے بعد عین ملاقات کے وقت بھی میر حسن کے بیان میں شرم و حجاب کا بہت لحاظ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس موقع کو اسطرح بیان کرتا ہے۔

بزور اُسکو لاکر بٹھایا جو وھاں ‍ ‍ نہ پوچھ اُس گھڑی کی اداکا بیاں

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے بدن کو چُرائے ہوئے ناز سے
مُنہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
گھڑی دو تلک وہ مہ و آفتاب رہے شرم سے پا بہ بند حجاب

۵۔ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان وغیرہ کی بیان کیجائے وہ لفظاً اور معنیً نیچرل و عادت کے موافق ایسی ہونی چاہیئے جیسی کہ فی الواقع ہوا کرتی ہے۔ اس موقع پر ہم بطور مثال کے **شوق** اور **میر حسن** دونو کی مثنویوں سے کچھ کچھ اشعار نقل کرتے ہیں۔

شوق جدائی کے زمانہ میں ملکہ کی حالت اسطرح بیان کرتا ہے۔

نہ رونے سے دم بھر تامل کیا نہ خاصہ بھی دن بھر تناول کیا
یہ نقشہ چمن کا مبدل ہوا کہ گلزار جو تھا وہ جنگل ہوا
وہ آتشکدہ سب چمن گل کا تھا صدا سوز کی نالہ بلبل کا تھا
دکھائی دیا یوں وہ نہر و نکا آب کہ ملکہ کی گویا ہے چشم پر آب
تھے رقاص طاؤس جو باغ کے نمونہ تھے ملکہ کے ہر داغ کے
لگے خوشے جو حسب دستور تھے وہ سب زخم ملکہ کے انگور تھے
شجر جتنے تھے صورتِ غم تھے سب جو تھے سرو وہ نخل ماتم تھے سب
صبا نے چمن میں اُڑائی تھی خاک دل ملکہ تھا مثل گل چاک چاک
ہوا دن تو رونے میں اُسکا بسر قیامت مگر رات آئی نظر

نہ پہلو میں پایا جو اُس یار کو / ہوا صدمہ اک جان بیمار کو

ذرا یاد بھولی نہ اُس ماہ کی / جو کروٹ بھی لی دل سے اک آہ کی

نظر آگیا چاندنی میں جو باغ / ہوا تازہ اس غم سے اک دل پہ داغ

ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی جو چلنے لگی / یہ فرقت کی آتش سے جلنے لگی

سحر تک دل اُس کا بھٹکتا رہا / کہ پہلو میں کانٹا کھٹکتا رہا

تصور جو تھا اُس گل اندام کا / کوئی پہلو نکلا نہ آرام کا

تڑپتی تھی پہ رنج جاتا نہ تھا / کسی طرح آرام آتا نہ تھا

خدا کھودے بنیاد اس چاہ کی / جدھر پھر گیا مُنہ اُدھر آہ کی

کبھی ہوگئے دونو رخسار زرد / کبھی ہوگئے دست و پا دونو سرد

کبھی رنگ رُخ کے بدلنے لگے / کبھی شعلے مُنہ سے نکلنے لگے

کبھی ضبط وہ چاہ کرنے لگی / کبھی چیخ کر آہ کرنے لگی

کبھی جان جینے سے عاری ہوئی / کبھی غش کی صورت سی طاری ہوئی

نہ نیند آئی ہرگز سحر ہوگئی / یہ شب اُسکے غم میں بسر ہوگئی

اُڑے آشیانوں سے اپنے پرند / ہوئی بانگ اللہ اکبر بلند

ہوا پھر تو یہ شاہزادی کا حال / کہ گھٹ کر ہو جوں ماہ کامل ہلال

تلاطم میں شب بھر طبیعت رہی / نہ رنگت رہی وہ نہ صورت رہی

بہت آگیا فرق اوقات میں / وہ کھسیانا ہو جانا ہر بات میں

وہ گرمی سے رُخ تمتمایا ہوا ۔۔۔ وہ رونے سے مُنہ بھربھرایا ہوا

وہ سوجی ہوئی بَرَنیاں اور گال ۔۔۔ وہ آنکھوں میں ڈورے پڑے لال لال

غرض کیا بیاں ہو کہ جو حال تھا ۔۔۔ جو دیکھے وہ رووے یہ احوال تھا

اگرچہ اس نظم میں اول کی چند بیتوں کے سوا سارا بیان بہت صاف اور نیچرل ہے، مگر **میر حسن** نے **شوق** سے تقریباً ستّر برس پہلے جب کہ زبانِ اُردو کی ابتدائی حالت تھی، اسی مقام کا سماں اُس سے زیادہ نیچرل طور پر باندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی ۔۔۔ بہانے سے جا جا کے سونے لگی

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب ۔۔۔ لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا ۔۔۔ نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے ۔۔۔ محبت میں دن رات گھٹنا اُسے

کہا گر کسی نے کہ بیوی چلو ۔۔۔ تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو

جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے ۔۔۔ تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے

کسی نے جو کچھ بات کی بات کی ۔۔۔ پہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے ۔۔۔ کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

جو پانی پلانا تو پینا اُسے ۔۔۔ غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نہ کھانے کی سُدھ اور نہ پینے کا ہوش ۔۔۔ بھرا دل میں اُسکے محبت کا جوش

کسی نے کہا سیر کیجے ذرا ۔۔۔ کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا

چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر — وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
نہفتہ اُسی سے سوال و جواب — سدا روبرو اُسکے غم کی کتاب
غزل یا رباعی و یا کوئی فرد — اُسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جسمیں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں — نہیں تو کچھ اس کی بھی پروا نہیں
سبب کیا کہ دل سے تعلق ہے سب — نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
زباں پر تو باتیں و لے دل اُداس — پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ مونہ کی خبر اور نہ تن کی خبر — نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں — جو کُرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مسّی ہے دو دن کی تو ہے وہی — جو کنگھی نہیں ہے تو یوں ہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام — نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سوبھاؤ — کہ بگڑے سے دونا ہو ان کا بناؤ
نہیں حُسن کی اسطرح بھی کمی — جو بیٹھی ہے بگڑی تو گویا بنی
غرض بے ادائی سے ہے یہاں کی ادا — بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہے بھلا

ان دونو نظموں میں بہ اعتبار سادگی اور نیچرل ہونے کے جو فرق ہے اُسکے بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن میر حسن کے بیان میں جہاں جہاں نیچرل حالت کی تصویر بعینہ کھینچی گئی ہے اُسکو جتا دینا ضرور ہے۔ بہانہ سے جا جا کے سونا۔ وحشت آلودہ خواب دیکھنا

جہاں بیٹھ جانا پھر وہاں سے نہ اُٹھنا۔ اگر کسی نے اُٹھنے کو کہا تو اُٹھ کھڑا ہونا نہیں تو بیٹھے رہنا۔ کسی نے حال پوچھا تو خیر و عافیت کہدی۔ کسی نے بات کی تو جواب دیدیا مگر بے ٹھکانے۔ کسی نے کھانے کو کہا تو کہا بہت اچھا نہیں تو کچھ نہیں۔ ہر کام اوروں کے کہنے سے کرنا نہیں تو کچھ نہ کرنا۔ دل ہی دل میں کسی سے سوال و جواب کرلے۔ دن رات کسی کی صورت آنکھوں کے سامنے رہنی۔ زبان سے باتیں کرنی اور دل میں اُداس رہنا۔ جو سر کھلا ہی تو کھلا ہی ہے جو کُرتی میلی ہے تو میلی ہی سہی۔ جو مسی نہیں مَلی تو یونہیں سہی۔ جو کنگھی نہیں کی تو بے کنگھی ہی سہی۔ نہ سرمہ سے مطلب نہ کاجل سے غرض۔ مگر بغیر بناؤ سنگار کے بھی بھلا لگنا اور بگڑنے سے اور زیادہ بننا۔ یہ سب ایسی سچّی اور پتے کی باتیں ہیں جو ہمیشہ ایسی حالتوں میں واقع ہوا کرتی ہیں۔ اگرچہ **شوق** کا بیان اور مثنویوں کی نسبت نہایت عمدہ ہی مگر جیسی جچی تُلی باتیں **میر حسن** نے بیان کی ہیں ویسی **شوق** کے ہاں بہت کم ہیں۔

جو لوگ صنعتِ الفاظ پر فریفتہ ہوتے ہیں اور لفظی مناسبتوں پر جان دیتے ہیں وہ کبھی کسی نیچرل حالت کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ یہی جدائی اور انتظار کا بیان **طلسم الفت** میں اسطرح کیا گیا ہے۔

شرم اُسکو حیا سے آنے لگی ۔۔۔ بے حجابی کے ناز اُٹھانے لگی

تمکین و وقاری کی قدر بڑھنے لگی ۔۔۔ چشم ترچھی نظر پہ چڑھنے لگی

ٹھنڈی سانسوں کا دم وہ بھرنے لگی ۔۔۔ سوز الفت کا پاس کرنے لگی

پان کے بدلے خونِ دل کھانا ۔۔۔ دیکھکر مہندی پانو پھیلانا
رات دن ہم کلام خاموشی ۔۔۔ یاد ہر دم زخود فراموشی
گرم صحبت تھی سردِ آہوں سے ۔۔۔ سرمہ بھی گر گیا نگاہوں سے
ناتوانی بھی زور کرنے لگی ۔۔۔ لاغری فکر گور کرنے لگی
آشنا دودِ آہ لب سے ہوا ۔۔۔ اوجِ سوزِ دل اس سبب سے ہوا
شدتیں دردِ دل کی سہنے لگی ۔۔۔ یاس پہلو کے پاس رہنے لگی
رنگ خونِ جگر بھی لانے لگا ۔۔۔ آنکھ سے جا بجا اشک آنے لگا
سرگرانی بھی سر اُٹھانے لگی ۔۔۔ بیقراری سے چین پانے لگی
کاجل اور آئینہ سے آٹھ پہر ۔۔۔ چشم پوشی تھی اُس کو مدِ نظر
روز افزوں تھا شوق کم سخنی ۔۔۔ زردیِ رنگ ۔ رُخ پہ غازہ بنی
چوٹی بھولے سے بھی نہ گُندھواتی ۔۔۔ پیچ و تاب اَور کنگھی سے کھاتی
ذکر سُن سُن کے لاکھے کا وہ نگار ۔۔۔ ہونٹ اپنے چباتی سو سو بار
ہمنشینوں سے ہوگئی نفرت ۔۔۔ کُنجِ عُزلت سے رہتی تھی خلوت
خشکیِ لب جو کرتی مونہ زوری ۔۔۔ صاف کر جاتی اُسکی غمخوری
بدلے ہنسنے کے روز رونا تھا ۔۔۔ خاک مسند کی جا بچھونا تھا
خاصہ جس وقت کوئی لاتی تھی ۔۔۔ گھڑیوں اُبکائی اُسکو آتی تھی
کوفت کھانے سے بس وہ جیتی تھی ۔۔۔ خونِ دل جائے آب پیتی تھی

گو کہ دردِ جگر مصاحب تھا ضبط آٹھوں پہر مصاحب تھا

گاہ آنکھیں لگی ہوئیں چھت سے شور ہے گاہ دردِ فرقت سے

دل سے کہنا کبھی نہیں سے دل دلربا کا یہ زعم ہے باطل

کچھ تو امید جی میں تھی کچھ یاس گاہ درجہ یقین کا گاہ ہراس

یہ مثنوی لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر آفتاب الدولہ مہر الملک خواجہ اسد علیخاں بہادر شمس جنگ متخلص بہ **قلق** کی ہے۔ سُنا ہے کہ اکثر اہل لکھنؤ اسکو اعلیٰ درجہ کی مثنوی سمجھتے ہیں۔ شاید ایسی ہی ہو۔ مگر افسوس ہے کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق سے بالکل آشنی نہیں رکھتی جو شعر ہمنے اس مقام پر اُس سے نقل کیے ہیں، اُنکی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ اس مثنوی کا تمام بیان اول سے آخر تک اسی قبیل کا ہے۔ لفظی رعایتوں میں معنی کا سررشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ اور کوئی حالت یا سماں جیسا کہ چاہیئے بیان نہیں ہو سکتا۔ اول کے چاروں شعروں میں پہلے مصرعوں کا تو بمشکل کچھ کچھ مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ مگر آخر کے چاروں مصرعوں کا مطلب ہماری سمجھ میں مطلق نہیں آیا۔ اِنکے بعد بھی اکثر مصرعے اسیطرح کے ہیں۔ باقی جن شعروں یا مصرعوں کا مفہوم کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ اُن میں کوئی بات سیدھی طرح نہیں بیاں کی ہے۔ مثلاً "اُسکو کسی کی شرم باقی نہیں رہی تھی" اسکو یوں بیان کیا ہے کہ "اُسکو شرم سے شرم آنے لگی" یا "رات دن وہ خاموش رہتی تھی۔" اسکی جگہ "وہ خاموشی سے ہمکلام رہتی تھی" یا "وہ خود فراموش رہتی تھی" اسکی جگہ "اُسکو خود فراموشی یاد رہتی تھی" غرضکہ کل اشعار کا حال جیساکہ ظاہر ہے ایسا ہی ہے یا اس سے بھی زیادہ ژولیدہ اور اُن پیچ

مثنوی **گلزارِ نسیم** میں بھی لفظی رعایتوں کا بہت التزام کیا گیا ہے۔ اُس نے بھی **بکاولی** کا حال تاج الملوک کے فراق میں کچھ مختصر سا لکھا ہے۔ وہ اسطرح بیان کرتا ہے

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس ہیں　　آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ　　کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذری بے خور و خواب　　زائل ہوئی اُس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ　　ہیات میں مثال رہ گئی وہ

اس بیان میں بھی تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا اور ظاہراً اُسنے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں۔ اُسکو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی۔ پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔ کپڑوں کی عوض رنگ بدلتی تھی وغیرہ وغیرہ۔

۲ ــــ قصہ میں اسبات کا بھی لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے۔ کیونکہ اس سے قصہ نگار کا پھوڑپن ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ سچ مچ اس مثل کا مصداق بنتا ہے کہ " دروغگو را حافظہ نباشد"، آج کل جو شایستہ ملکوں میں نوول لکھے جاتے ہیں اُنکا تو کیا ذکر ہے۔ ایشیا کے قدیم زمانہ کے قصہ نویسوں نے بھی اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھا ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کے منافی نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ قصہ میں کسی خاص واقعہ کا بیان نہیں ہوتا۔ مگر قصہ نگار اُسکو ایک واقعہ ہی کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ پس اُسکو ایسے طور پر بیان کرنا جس سے جا بجا اُسکی غلط بیانی ثابت ہو اصول قصہ نگاری کے خلاف ہے

جو کاریگر کسی انسان کی مورت پتھر یا دھات کی بناتا ہے ظاہر ہے کہ وہ مورت انسان کی نقل ہوتی ہے نہ اصلی انسان۔ لیکن کاریگر کا فرض ہے کہ اُسمیں اور اصلی انسان میں ایک جان پڑنے کے سوا اور کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ اسیطرح قصہ نگار کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ قصہ بالکل واقعات کی شکل میں بیان کیا جائے۔ اِس مطلب کے ذہن نشین کرنے کے لیئے ہم چند شعر مثنوی طلسم اُلفت کے نقل کرتے ہیں۔ ایک قصہ گو۔ شاہزادہ عشق آباد یعنی **جان جہان** سے حُسن آباد کی شہزادی **عالم آرا** کا حال اپنی آنکھوں دیکھا بیان کر رہا ہے۔ کہ جب میں حُسن آباد میں پہنچا تو ایک شخص نے مجھسے عالم آرا کے حُسن و جمال کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہا

" دیکھنا بھی تو اُسکا مشکل ہے — کہ وہ لیلی بیانِ محمل ہے "

(یعنے پردہ میں ہے)

" آدمی کیا ملک سے پردہ ہے — بلکہ چشم فلک سے پردہ ہے "

اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکو بڑے اہتمام کے ساتھ پردہ میں رکھا جاتا ہے۔ مگر اسی بیان میں اُسکا ذکر ہوتے ہوتے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ باغ میں جس دریچہ میں جاکر وہ بیٹھتی ہے وہاں۔

" تہِ بام اژدہام رہتا ہے — مجمع خاص و عام رہتا ہے "

" مشقِ جور و ستم کسی پر ہے — چشم لطف و کرم کسی پر ہے "

" ناز سے ایک سے کلام کیا — ایک کو غمزہ سے تمام کیا "

" وصل کا ایک سے کیا اقرار — ایک مشتاق سے کیا انکار "

" دو ہی فقروں میں اک کو ٹال دیا — ٹھٹھے بازی میں اک کو ڈال دیا "

کھینچ مارا کسی پہ ہنس کے اگال رنج سے مونہ کسیکا ہو گیا لال
دور سے ہنسکے اک کو شاد کیا قربِ پردہ کسیکو یاد کیا
یوں ہی وہ دن تمام ہوتا ہے کیا کہوں قتل عام ہوتا ہے
دو گھڑی دن رہے سے تا سرِ شام جلوہ آرا رہی وہ مہر اندام

غرض کہاں تک لکھوں دور تک ایسے ہی اشعار جنمیں نہ صرف بے پردگی بلکہ غایت درجہ کا بیسواپن پایا جاتا ہے چلے جاتے ہیں۔ اس بیان میں اور اوپر کے دونو شعروں کے بیان میں جو منافات ہے وہ ظاہر ہے۔ ایسی مثالیں اس مثنوی میں اور گلزار نسیم میں بہت ہیں۔ مگر اور مثنویاں بھی اس سے بالکل پاک نہیں ہیں۔

۷ ـــ اس بات کا بھی خیال رکھنا ضرور ہے کہ قصہ کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کیجائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ جسطرح ناممکن اور فوق العادۃ باتوں پر قصہ کی بنیاد رکھنی آج کل زیبا نہیں ہے۔ اسی طرح قصہ کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی جن کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس سے قصہ نگار کی اتنی بے سلیقگی ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ اُس کی لاعلمی اور دنیا کے حالات سے ناواقفیت اور ضروری اطلاع حاصل کرنے سے بے پروائی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً بدر منیر میں ایک خاص موقع اور وقت کا سماں اسطرح بیان کیا ہے۔

وہ گانے کا عالم وہ حسنِ بتاں وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
درختوں کی کچھ چھانو اور کچھ وہ دھوپ وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ

اخیر مصرع سے صاف یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ایک طرف دھان کھڑے تھے اور ایک طرف سرسوں پھُول رہی تھی۔ مگر یہ بات واقع کے خلاف ہی کیونکہ دھان خریف میں ہوتے ہیں اور سرسوں ربیع میں گیہوں کے ساتھ بوئی جاتی ہے

یا مثلاً مثنوی طلسم الفت میں جبکہ شاہزادہ **جان جہان** کا جہاز غرق ہولہے اور جان جہاں اور سب اہل جہاز ڈوب چکے ہیں۔ اسطرح بیان کرتا ہے۔

دوسرے دن وہ گوہرِ یکتا　　جھیل کر محنتِ محیط بلا

مثلِ خورشید ڈوب کر نکلا　　زندہ اک تختہ پر مگر نکلا

یعنی جان جہان ایک رات اور ایک دن ڈوبے رہنے کے بعد زندہ دریا سے نکلا اور نکلا بھی ایک تختہ پر بیٹھا ہوا۔ اول تو اسقدر عصہ کے بعد زندہ نکلنا اور پھر قعر دریا سے ایک تختہ پر بیٹھے ہوئے نکلنا۔ بالکل تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے

۸ — جسطرح اُن اہم اور ضروری باتوں کو جن پر قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرنا ضرور ہے۔ اسیطرح اُن ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں ہیں رمز وکنایہ میں بیان کرنا ضرور ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری مثنویوں میں دونو باتوں کا بہت کم لحاظ کیا گیا ہے۔ مثلاً گل بکاولی کے قصہ میں سارے قصہ کی بنیاد صرف اس بات پر رکھی گئی ہے کہ زین الملوک کے جب پانچواں بیٹا پیدا ہوا تو نجومیوں نے یہ حکم لگایا کہ اگر بادشاہ اس بیٹے کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھیگا تو اُسکی بینائی جاتی رہے گی۔ مگر گلزار نسیم میں اس بات کو ایسا نا کافی طور پر بیان کیا ہے کہ اگر گل بکاولی کا قصہ پہلے سے کسیکو معلوم نہ ہو تو

اُسکی سمجھ میں کچھ نہیں آسکتا۔ رہی دوسری بات سو اُسکا خیال تو ہمارے شعرا نے کبھی بھولکر بھی نہیں کیا بلکہ جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہیں وہاں اور بھی زیادہ پھیل پڑتے ہیں۔ اور نہایت فخر کے ساتھ ناگفتنی باتوں کو کُھلم کُھلا بیان کرتے ہیں۔ افسوس کہ ہم ایسے موقعوں کی زیادہ صاف اور کُھلی ہوئی مثالیں نہیں دے سکتے۔ صرف تصریح اور کنایہ کی صورت زیادہ ذہن نشین کرنے کے لیئے یہاں ایک سرسری مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ خواجہ **میر اثر** دہلوی اپنی مثنوی **خواب و خیال** میں اختلاط کے موقع پر کہتے ہیں۔

"ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا کُھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا"

دوسرے مصرع میں اس بات کی کچھ تصریح نہیں کی گئی کہ کیا چیز کُھلتی جاتی تھی اور کس چیز کو بار بار ڈھانپا جاتا تھا۔ یہ مطلب اس سے بہتر لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسے موقع پر ہمیشہ بولا بھی یونہیں جاتا ہے کہ سینے یا چھاتی یا محرم وغیرہ کا صراحۃً نام نہیں لیا جاتا۔ اسی مطلب کو نواب مرزا **شوق** نے **بہار عشق** میں اسطرح ادا کیا ہے

"ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا"

شوق نے اتنا پردہ تو رکھا ہے کہ لباس ہی کے نام پر اکتفا کیا ہے سینے وغیرہ کا نام نہیں لیا۔ مگر پردہ ایسا باریک ہے کہ اُس میں بدن جھلکتا نظر آتا ہے۔

تصریح کچھ بے شرمی و بے حیائی ہی کے موقع پر بدنما نہیں ہوتی۔ بلکہ قصہ میں اکثر مقام ایسے آجاتے ہیں کہ اگر وہاں رمز و کنایہ سے کام نہ لیا جائے تو کلام نہایت سبک اور کم وزن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بحث فی الواقع چوتھی دفعہ سے علاقہ رکھتی ہے جس میں مقتضائے حال کے

سوا فقِ ایرادِ کلام کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اسکو زیادہ اہم سمجھکر خصوصیت کے ساتھ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

ان آٹھ باتوں کے سوا قصہ نگاری کے اور بھی فرائض ہیں۔ مگر یہاں صرف انھیں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر ہمارے ہموطنوں کو شاعری کی اصلاح کا خیال ہوگا تو اُن کو کسی کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے خود اُن کی طبیعت اُن کی رہنمائی کرے گی۔

اب ہم خاص اُن مثنویوں پر جو ہمارے نزدیک کسی نہ کسی حیثیت سے امتیاز رکھتی ہیں ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ اب تک اُردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر سے گذری ہیں۔ اُن میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم و بیش ادا ہوئے ہیں۔ اول **میر تقی** جنھوں نے غالباً سب سے اول چند عشقیہ قصے اردو مثنوی میں بیان کیے ہیں۔ جس زمانہ میں **میر** نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اُسوقت اُردو زبان پر فارسیت بہت غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اردو زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور اگر ایک آدھ نمونہ موجود بھی ہو تو اُس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی۔ اسکے سوا اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی۔ مگر مثنوی کا رستہ صاف ہوتے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا اسی لیئے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اُردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی۔ اُس اندازہ سے جو آج کل فصیح اردو کا معیار ہے بلاشبہہ کسیقدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اُردو زبان کے بہت سے الفاظ و محاورات جو اب متروک ہوگئے ہیں میر کی مثنوی میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں میر کی غزل میں بھی کم و

بیش پائی جاتی ہیں۔ مگر غزل میں اُن کی کھپت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ غزل میں اگر ایک شعر بھی صاف اور عمدہ نکل آئے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے۔ وہ عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے اور باقی پُرکن اشعار سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ لیکن مثنوی میں جستہ جستہ اشعار کے صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ پس ان اسباب سے شاید میر کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں نہ بچے۔ مگر اس سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جس وقت میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں۔ اُس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنی امکان سے خارج تھی باانیہمہ میر کی مثنوی اکثر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے۔ باوجودیکہ میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گذری ہے مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو اُنھوں نے کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور مطالب کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے جیسا کہ ایک مشاق و ماہر اُستاد کر سکتا ہے۔ اسکے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بمقابلہ اُن اشعار کے جن میں پُرانے محاورے یا فارسیت غالب ہے کچھ کم نہیں ہیں۔ صدہا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زبان زد چلے جاتے ہیں۔

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ نہ اُن میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا سماں بیان کیا گیا ہے۔ نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہے۔ مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہمنے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز

اور عام مثنویوں کے برخلاف سب بے شرمی و بے حیائی کی باتوں سے مبرا ہیں۔

میر تقی کے بعد میر حسن دہلوی کی مثنوی بدر منیر نے ہندوستان میں جو سچی شہرت اور قبولیت حاصل کی ہے۔ وہ نہ اُس سے پہلے اور نہ اُسکے بعد آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ خیال کہ میر تقی کے نمونوں سے میر حسن کو کچھ مدد ملی ہوگی یا کچھ رہبری ہوئی ہوگی۔ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ قصہ کی شان جو میر حسن کی مثنوی میں ہے میر تقی کی مثنویوں میں اُسکا کہیں پتا بھی نہیں۔

اگر اس بات سے قطع نظر کرلی جائے کہ قدیم قصوں کی طرح اس مثنوی کی بنیاد بھی دیو افسانوں پر رکھی گئی ہے تو یہ کہنا کچھ بے جا نہیں ہی۔ کہ میر حسن نے قصہ نگاری کے تمام فرائض پورے پورے ادا کردیئے ہیں۔ سلطنت کی شان و شوکت۔ تختگاہ کی رونق اور چہل پہل۔ لاولدی کی حالت میں یاس و ناامیدی اور دنیا سے دل برداشتگی۔ جوتشیوں کی گفتگو۔ شاہزادہ کی ولادت اور چھٹی کی تقریب۔ ناچ رنگ اور گانے بجانے کے ٹھاٹھ۔ باغوں اور ہر قسم کی محفلوں کے سمے۔ سواریوں کے جلوس۔ حمام میں نہانے کی کیفیت اور حالت مکانوں کی آرایش۔ شاہانہ لباس اور جواہرات اور زیورات کا بیان۔ خوابگاہ کا نقشہ۔ جوانی کی نیند کا عالم۔ رنج اور غم کے عالم میں محلوں اور باغوں کی بے رونقی۔ عاشق و معشوق کی پہلی ملاقات اور اُس میں شرم و حجاب کا پاس و لحاظ۔ عشق و محبت کا بیان۔ حُسن و جمال کا بیان۔ جدائی کا بیان۔ مصائب کا بیان۔ خوشی کا بیان۔ نسبت کے پیغام و سلام۔ بیاہ شادی کے سامان بچھڑے ہوؤں کا ملنا اور اُس حالت کا نقشہ۔ غرضکہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا ہی اُس کی

آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچدی ہے۔ اور مسلمانوں کے اخیر دَور میں سلاطین و اُمرا کے ہاں جو جو حالتیں ایسے موقعوں پر گذرتی تھیں اور جو معاملات پیش آتے تھے اُنکا بعینہٖ چربا اُتار دیا ہے۔ میر حسن کے بعد اور مثنویوں میں بھی بدرِ منیر کی ریس سے یہ تمام سین دکھانے کا قصد کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر راہ راست سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ایک صاحب بازار کی تعریف میں کہتے ہیں کہ " وہاں ناز و شوخی و انداز کی جنس بکتی ہے (یعنی کوئی جنس دستیاب نہیں ہوتی) ٹھنڈی سانسوں کا بازار گرم رہتا ہے (یعنی بازار میں بالکل رونق نہیں) داغِ دل کا سکہ ہر طرف بُھنایا جاتا ہے (یعنی سکۂ رائج کی ریزگاری نہیں ملتی) خارِ مژگاں کے کانٹے میں زرِ جان تُلتا ہے (یعنی نہ وہاں سونا ہے نہ سونا تولنے کا کانٹا) میوہ فروش سیبِ ذقن بیچتے ہیں (یعنی سیب نہیں ملتے) ترکاری کی جگہ جوبن بکتا ہے (یعنی ترکاری نہیں ملتی) حلوائیوں کی دوکان پر شیرۂ جان کی مٹھائی بنتی ہے (یعنی لڈو پیڑے اور بالوشاہی وغیرہ کا قحط ہے) بازار میں آبِ گوہر کا چھڑکاؤ ہوتا ہے اور مہرو ماہ کا کٹورا بجتا ہے (یعنی بازار میں خاک اُڑتی ہے اور ہر وقت سناٹا رہتا ہے) اسیطرح جو سین دکھانا چاہا ہے اُسمیں محض الفاظ کا طلسم باندھا ہے معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھا۔ بہرحال اُردو کی عشقیہ مثنویوں میں ہمارے نزدیک اکثر اعتبارات سے بدرِ منیر کے برابر آجتک کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ البتہ اُس میں کچھ الفاظ و محاورات ایسے ضرور ہیں جو کہ اب متروک ہو گئے ہیں۔ لیکن آج سے ستر اسی برس پہلے کی مثنوی کا حُسن اور زیور یہی ہے کہ اُس میں ایسے الفاظ و محاورے موجود ہوں۔

میر حسن کے بعد نواب مرزا **شوق** لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ **شوق** نے غالباً واجد علی شاہ کے اخیر زمانۂ سلطنت میں یہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں سے تین؎ مثنویوں میں اُسنے اپنی بوالہوسی اور کامجوئی کی سرگذشت بیان کی ہے یا یوں کہو کہ اپنے اوپر افترا باندھا ہے۔ اور ایک مثنوی یعنی لذتِ عشق میں ایک قصہ بالکل بدر منیر کے قصے سے ملتا جلتا اُسی کی بحر میں لکھا ہے۔ اِن مثنویوں میں اکثر مقامات ایسے اَن مورل اور خلاف تہذیب ہیں کہ ایک مدت سے ان تمام مثنویوں کا چھپنا حکماً بند کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایک خاص حد تک انکو بدر منیر پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ وہ قدیم الفاظ اور محاوروں سے جو اَب متروک ہو گئے ہیں اور حشو اور بھرتی کے الفاظ سے بالکل پاک ہیں۔ اُن میں ایک قسم کا بیان۔ زبان کی گھلاوٹ روزمرہ کی صفائی۔ قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے بمقابلہ بدر منیر کے بہت بڑھا ہوا ہے۔ اُن میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اسطرح برتا ہے کہ نثر میں بھی ایسی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔ اگرچہ اِن مثنویوں میں بدر منیر کی طرح ہر موقع کا سین نہیں دکھایا گیا۔ جس سے شاعر کی قدرتِ بیان کا پورا پورا اندازہ ہو سکے مگر جو کچھ اُسنے بیان کیا ہے خواہ وہ مورل ہو اور خواہ اَن مورل۔ اُس میں حسن بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اُسنے برخلاف عام شعرائے لکھنؤ کے لفظی رعایتوں کا مُطلق التزام نہیں کیا۔ اور اُردو کے عام روزمرہ کو صحتِ الفاظ پر جسکے اہل لکھنؤ سخت پابند ہیں

؎ یعنی بہارِ عشق۔ زہرِ عشق اور فریب عشق ہیں ۱۲

اکثر ترجیح دی ہے۔ ردیف و قافیہ میں عروضیوں کی بے جا قیدوں کی بھی چنداں پابندی نہیں کی۔ مگر جو اصل مقصود ردیف و قافیہ سے ہوتا ہے۔ اُسکو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً

کوئی مرتا ہے کیوں؟ بلا جانے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس ردیف کو ہمارے شعرا ضرور غلط بتائیں گے۔ مگر ردیف کا جو اصل مقصد ہے وہ اس سے بخوبی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ سامع کو یہ شعر سُن کر واحد اور جمع کا فرق مطلق محسوس نہیں ہوتا اور یہی ردیف کا ماحصل ہے۔ اختلاط کے موقع پر جس بے تکلفی کے ساتھ معاملات کی تصویر اُسنے کھینچی ہے۔ اُس کی نسبت سوا اسکے اَور کیا کہا جائے کہ " چور کی ماں گھٹنوں میں سر دے اور روئے "۔ افسوس ہے کہ شوق کی مثنویوں کی اس سے زیادہ اور کچھ داد نہیں دی جاسکتی کہ جو شاعری اُسنے ایسی اَن سورل مثنویوں کے لکھنے میں صرف کی ہے اگر وہ اسکو اچھی جگہ صرف کرتا اور روشنی کے فرشتے سے تاریکی کے فرشتے کا کام نہ لیتا تو آج اُردو زبان میں اُسکی مثنویوں کا جواب نہ ہوتا۔

یہ بات تعجب سے خالی نہیں کہ نواب مرزا شوق کو اپنے اسکول کے برخلاف مثنوی میں ایسی صاف اور بامحاورہ زبان برتنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ کیونکہ جب سوسائٹی کا رُخ دوسری طرف پھرا ہوا ہوتا ہے تو اُسکے مخالف رُخ بدلنے کے لیئے کسی خارجی تحریک کا ہونا ضروری ہے۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر دہلوی نے جو ایک مثنوی لکھی ہے۔ جسکا نام غالباً **خواب و خیال** رکھا تھا اور جسکی

شہرت ایک خاص وجہ سے زیادہ تر پورب میں ہوئی تھی۔ اُس مثنوی میں جیسا کہ ہم نے اپنے بعض احباب سے سُنا ہے۔ تقریباً ۴۰۔ ۵۰ شعر اسی قسم کے ہیں جیسے کہ شوق نے **بہارِ عشق** میں اختلاط کے موقع پر اُنسے بہت زیادہ لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق کو ایسی صاف زبان برتنے کا خیال اُس مثنوی کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اور چونکہ وہ ایک شوخ طبع آدمی تھا۔ اور بیگمات کے محاورات پر بھی اُسکو زیادہ عبور تھا اُس نے اپنی مثنوی کی بُنیاد خواب و خیال کے اُنھیں ۴۰۔۵۰ شعروں پر رکھی۔ اور اُن معاملات کو جو خواجہ میر اثر کے ہاں ضمناً مختصر طور پر بیان ہوئے تھے۔ اپنی مثنوی میں زیادہ وسعت کے ساتھ بیان کیا اور جس قسم کے مخاروں کی اُنھوں نے بنیاد قائم کی تھی شوق نے اُسپر ایک عمارت چُن دی اسکا بڑا ثبوت یہ ہے کہ خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں۔ جنمیں سے ایک دو شعر ہمکو بھی یاد ہیں۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب و خیال کو بہارِ عشق سے کچھ نسبت نہیں ہوسکتی۔

اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ اس کی نسبت یہ امید رکھنی کہ ہمارے دیرینہ سال شاعر جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ اس مضمون کی طرف التفات کرینگے یا اسکو قابلِ التفات سمجھیں گے محض بے جا ہے۔ اور یہ خیال کرنا بھی فضول ہے کہ جو کچھ اسمیں لکھا گیا ہے وہ سب واجب التسلیم ہے۔ البتہ ہمکو اپنے نوجوان ہموطنوں سے جو شاعری کا چسکا رکھتے ہیں اور زمانہ کے تیور پہچانتے ہیں یہ اُمید ہے کہ وہ شاید اس مضمون کو پڑھیں اور کم سے کم اسقدر تسلیم کریں کہ اُردو شاعری کی موجودہ حالت بلا شبہہ اصلاح یا ترمیم

کی محتاج ہے۔ ہم نے اپنی ناچیز رائیں جو اس مضمون میں شاعری کی اصلاح کے متعلق ظاہر کی ہیں گو اُنمیں سے ایک رائے بھی تسلیم نہ کی جائے۔ لیکن اس مضمون سے ملک میں عموماً یہ خیال پھیل جائے کہ فی الواقع ہماری شاعری اصلاح طلب ہے تو ہم سمجھیں گے کہ ہمکو پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزّل کا یقین ہی۔

اگرچہ اُردو شاعری کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیئے اس بات کی نہایت ضرورت تھی کہ مشہور اور مسلم الثبوت شاعروں کے کلام پر صراحۃً نکتہ چینی کیجائے کیونکہ عمارت کا بودا پن جیسا بُنیاد کی کمزوری سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہموطن ابھی اعتراض سُننے کے عادی نہیں ہیں۔ بلکہ تنقید کو تنقیص سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ہوسکا ہی اس مضمون میں کسی خاص شاعر کے کلام پر کوئی گرفت یا اعتراض اسطرح نہیں کیا گیا جو خاص اُسکے کلام سے خصوصیّت رکھتا ہو۔ بلکہ شاعری کے عام طریقہ پر اعتراض کر کے مثال کے طور پر جس کسی کا کلام یاد آیا ہے نقل کر دیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس شخص پر بالتخصیص اعتراض کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ شاعری کے عام طریقہ کی خرابی ظاہر کرنی مقصود ہے۔ جسمیں اُس شخص کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔ اسکے علاوہ جہاں تک ممکن تھا کسی پر کوئی ایسا اعتراض نہیں کیا۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ اپنی شاعری کے اصول مسلمہ سے ناواقف ہے۔ یا اُسنے کوئی گریمر یا عروض کی غلطی کی ہے۔ یا کوئی ایسی فروگذاشت کی ہے جس سے قدیم طریقہ کے موافق اُسکی شاعری پر حرف آتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر ایسے اعتراض کیئے ہیں جو نہ صرف اُردو شاعری بلکہ تمام ایشیائی شاعری پر وارد ہوتے ہیں۔

بااینہمہ اگر بمقتضائے بشریت کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو ہمارے کسی ہموطن کو ناگوار گذرے تو ہم نہایت عاجزی اور ادب سے معافی کے خواستگار ہیں۔ اور چونکہ یہ مضمون اُردو لٹریچر میں جہاں تک کہ ہمکو معلوم ہے بالکل نیا ہے اسلیئے ممکن ہے کہ اگر بالفرض اسمیں کچھ خوبیاں ہوں تو اُنکے ساتھ کچھ لغزشیں اور خطائیں بھی پائی جائیں۔ اگرچہ خدانے تو یہ قاعدہ بتایا ہے کہ "اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ"٭ مگر انسان نے اُسکی جگہ یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ "اِنَّ السَّيِّئَاتِ يُذْهِبْنَ الْحَسَنَاتِ" پس اِس انسانی قاعدہ کے موافق ہمکو یہ امید رکھنی تو نہیں چاہیئے کہ اس مضمون کی غلطیوں کے ساتھ اُسکی خوبیاں بھی (اگر کچھ ہوں) ظاہر کیجائیں گی۔ لیکن اگر صرف غلطیوں کے دکھانے ہی پر اکتفا کیا جائے اور خوبیوں کو بہ تکلف بُرائیوں کی صورت میں ظاہر نکیا جائے۔ تو بھی ہم اپنے تئیں نہایت خوش قسمت تصور کرینگے۔

٭ یعنی نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ پس دوسرے فقرہ کے یہ معنی ہونگے کہ بدیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں ۱۲

راقم

الطاف حسین حالی

کتبہ ضعیف العباد فقیر محمد الدین عفا اللہ عنہ و رزقہ رزقاً طیباً و ایماناً کاملاً "جنڈیالوی"

دیوان حالی

جس میں قطعات۔ غزلیات۔ قصیدے۔ مرثیے
ترکیب بند۔ رباعیاں۔ تاریخیں۔ اور
اور متفرق اشعار شامل
ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے ۔۔۔ یہ ہی بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق (عاشق ہونا ۱۲) یا تعشّق (عاشق بننا ۱۲) کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا اول تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اُس جوش اور ولولہ سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اور شعر کی ذات میں جو ایک آتشگیر مادّہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے۔ پھر قوم[8] کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اسی خیال کی تائید کرتا تھا۔ باینہمہ حداثتِ سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہدِ رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیرزال کی صورت میں کیا جائے اور شرابِ ارغوانی کی جگہ سرکۂ بے نمک سے ضیافتِ طبع کی جائے۔ غرضکہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا۔ بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔ اُس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اُچھلا آنکھیں بند کیں اور اُسی شارعِ عام پر پڑلیے جس پر رہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلہ کا ساتھ۔ راہ کی ہمواری۔ اور رہگذر کی فضا چھوڑ کر

---

8 قوم سے یہاں اُس کے متعارف معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں قوم سے مراد شعرا ہیں ۱۲

دوسرا رستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا۔ وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل و تشبیب کی اُمنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی۔ اور جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

" یقُولون ھل قبل الثلثین مَلْعَبٌ[8]   فقلتُ وھل بعد الثلثین مَلْعَبٌ "

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں مونہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہی۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمّی باتوں پر آفرین سننے سے دلشکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سُننی بہتر ہے۔ اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے۔ کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔

یکرہ بحال خویش ہم آخر تواں گریست   تا چند بر فلان و بہ بہماں گریستن

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند۔ مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی۔ اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ جو نظمیں کسیقدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی ہیں۔ اب زیادہ تر کچھ بچے کھچے متفرّق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں۔ جنہیں سے کسیقدر قطعہ و رباعی کے لباس ہیں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کئے گئے ہیں ان کے سوا چند ترکیب بند۔ ایک آدہ مسمط۔ کچھ قصیدے اور کچھ تاریخیں ہیں۔ جنہیں سے اکثر خاص خاص

[8] یعنی لوگ کہتے ہیں کہ کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہی؟ سو میں نے اُنسے کہا کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟ ۱۲

طور پر وقتاً بعد وقتٍ شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں پہلا کلام جو عالمِ جہل و نادانی یا خلاصۂ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسیقدر تلف ہوجانے کے بعد جسقدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا مقتضٰے ہے کہ جو کام اُسکی تھوڑی یا بہت کوشش سے سرانجام ہوتا ہے عام اس سے کہ اچھا ہو یا بُرا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو وہ اُسکو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے جس فخر کے ساتھ کہ وہ اعرابی[8] جسنے کبھی آبِ شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا ایک کھاری پانی کے چشمہ سے مشک بھر ہارون رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لے گیا تھا۔ وہ اُس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کلمبس امریکا دریافت کرکے ازبلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ پس یہ تمام مجموعہ جسمیں کچھ نئے اور کچھ پُرانے خیالات شامل ہیں محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھئے مردود ہو یا مقبول۔ مُلک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانہ کے خیالات میں پہلے زمانہ کی نسبت حقائق و واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے۔ اور جیسی کہ امید کیجاتی ہے ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں ایسے سچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہمکو بھی معلوم نہیں۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولہ سے ہوتا ہے ویسا ہی

[8] یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہارون رشید کے زمانہ میں ایک بدوی جسنے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزا نہ چکھا تھا۔ اُس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا۔ جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے کچھ نسبت نہ رکھتا تھا۔ لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوی ہمیشہ پیا کرتا تھا۔ اُس سے کسیقدر میٹھا تھا۔ وہ خوشی خوشی اُس کی ایک مشک بھر کر بغداد میں پہنچا۔ اور خلیفہ کے دربار میں اُس کو بطور ایک علقِ نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اُس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا۔ مگر اُس کی بدمزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ اور اُس کو انعام دے کر رخصت کیا۔ اور حکم دیدیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا۔ ۱۲

بلکہ بعض اوقات اُس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش۔ تحسین و آفرین کے لالچ۔ جلب منفعت کی توقع۔ یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگرچہ ہم اُس وقت نہونگے۔ مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ اور پانی کو الگ کیئے بغیر نہ رہے گا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا۔ اور جھوٹ برسات کے سبزہ کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔

"وکُم قد رأینا من فُروعٍ کثیرۃٍ تمُوتُ۔ اذا لم یُحیِیہنّ اصولُ"

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیا اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے۔ مگر اسلوب بیان میں مُطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح۔ ہجا۔ غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید۔ مناجات۔ اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاصکر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہو کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر اُن کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہو کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیئے اُسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے۔ اور اپنی وضع۔ صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کردے۔ اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی

8 ترجمہ۔ ہمنے وہ شاخیں اکثر سوکھتی دیکھی ہیں جن کی جڑیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شاخوں کو سرسبز رکھ سکیں ۱۲

سخت ضرورت ہی کہ طرز بیان میں قدما کی طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو اُنھیں پیرایوں میں ادا کرے۔ جنسے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔ اور قدما کا دل سے شکرگذار ہو جو اُسکے لئے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعہ کو اور نیز اُن نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھکر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی ایسے اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں۔ اور نہ طرز بیان ہی میں کوئی ایسی جدت ہی جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور یہ سمجھکر وہ بے اختیار پکار اُٹھیں کہ "ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ" پس اُن کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا میں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو اُن کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محل نہیں بدلے مگر محل نشین بدل گئے ہیں۔ اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گذرے ہوں۔ یا کسی کے ذہن کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے۔ بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و نا شاعر کے دل میں ہمیشہ گذرتے ہیں اور ہر وقت اُن کے پیش نظر ہیں۔ مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور متبذل ہیں اُنکو حقیر سمجھکر چھوڑ دیا گیا اور اُن کی طرف بہت کم التفات کیا گیا۔ اور پایۂ شاعری کو اُن سے وراء الورا

---

8 قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے ھذا الذی رزقنا من قبل (یعنے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزا اور لذت جُدا ہوگی ۱۲

سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید انھیں مبتذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہی ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لا سکے۔ اُسکی بڑی دَوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اُس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چونہ کا۔ یا بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے۔ اسیطرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مصالح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مصالح کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو روزمرّہ ہماری آنکھوں کے سامنے گذرتے ہیں۔ خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں۔ یا زمین۔ آسمان۔ چاند۔ سورج۔ پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے۔ یا مچھّر۔ مکڑی اور بھُنگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے۔ پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھکر چھوڑ دیا۔ اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی۔ اُسکی مثال اُس معمار کیسی ہوگی جو عمارت بنانے کے لئے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہوسکتی۔

"ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کاین رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست"

الغرض جب سے شاعری کی لَے کھُلی۔ معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزولِ مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانہ کے حالات دیکھکر جو

کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن وقعات کے سُننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی اُنکو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقہ کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورتِ وقت اقوالِ سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیئے گئے۔ کہیں اُن کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اُسکو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات و رباعیات میں خلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیئے گئے جو شائد کہیں کہیں مطائبہ کی حد کو پُہنچ گئے ہوں مگر انوری و سعدی و شفائی کے مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریا و مکر و سالوس و عُجب و خود پسندی اور اَور اسی قسم کے۔ اخلاق وعظ و زہد و صوفی و شیخ و مُلا پر ڈھالے گئے۔ نہ اسلیئے کہ نعوذ باللہ اس فرقۂ علیہ کی مذمت مقصود تھی۔ بلکہ اسلیئے کہ ان خلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تر کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبّا جیسا اُجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں۔ مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسیطرح ریا و عُجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے۔ مگر جب اُسکو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈرانی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعری کی علّتِ غائی ہے۔

شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اُسکو بضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اسلیئے ہمکو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے۔ مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود بُرائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو اُن سے

بازرہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچکر دکھاتا ہے۔ اور گھر کے بھیدی کیطرح چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے۔ اسلیئے سمجھنا چاہیئے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ۔ پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔ پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے۔

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اسکو ساری — **حالی** سے بدگمانی بیجا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہوسکے کہ اُسمیں فطرتِ انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جسکی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو وہ پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ خود اُس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اسیطرح ایک دوسرا شاعر جسنے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقہ سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا وہ رندو داو باش کی صحبتوں کا ایسا چربا اُتار دیتا ہے کہ گویا اُنھیں میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ **ابونواس** نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع سُنکر جسمیں رات کے تخلیہ اور عیش و عشرت کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا۔ اُس مصرع کی تضمین میں ایسے واقعات بیان کردیئے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہوکر بے ساختہ یہ کہہ اُٹھتا تھا "قَاتَلَکَ اللهُ کَاَنَّکَ کُنْتَ ثَالِثَنَا"[8] **شکسپیر** جسکے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنیوالے

[8] ترجمہ۔ خدا تجھکو غارت کرے گویا کہ تیسرا ہم میں تو تھا یعنی تونے ایسے صحیح واقعات بیان کیئے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا ۱۲

تھے اور جنے کبھی آنکھ کھولکر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی اُسنے میکبت - جولیٹ - کیتھراین - ڈزڈمونا - اور بعض اور لیڈیوں کے ایسے اصلی کیرکٹر دکھائے ہیں جن کا اُس سوسائٹی پر جسمیں اُسکی عمر گذری تھی کبھی پرچھاواں تک نہ پڑا تھا۔ ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس - رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکانے کی لکھ جاتے ہیں جنسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود اُنپر گذرے تھے -

اس عذر سے اگرچہ کسیقدر شاعر کی برارت ہوسکتی ہے - مگر پھر بھی اُسکو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جا سکتا - ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے - بخلاف شاعر کے کہ اُسکا اصل مقصود فطرت انسانی کی کُرید - اور واقعاتِ دہر سے متاثر ہوکر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس - وہ کسی کے سمجھانے کے لیئے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھکر چیخ اُٹھتا ہے -

ناصحِ مشفق ہیں یاروں کے نہ مُصلح اور مُشیر   دردمند اُنکے نہ اُنکے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھکر   نالۂ بے اختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اُسکے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اُسکو واعظ یا ناصح قرار دیکر یہ الزام دینا نہیں چاہیئے کہ "اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ" - بلکہ اُسکی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیئے کہ "اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ"

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقض پایا جانا ایک ضروری بات ہے بلکہ اُسکے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کما قال اللہ تعالی "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" مگر جسطرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا

اُس تصنیف کو عیب لگاتا ہے۔ اسطرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا بلکہ اُسکا بیساختہ پن ظاہر کرتا ہے جسکو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیئے۔ فلسفی یا مؤرخ ہر ایک چیز پر اُسکے تمام پہلو دیکھکر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے۔ اور اسلیئے ضرور ہے کہ اُسکا بیان جامع و مانع ہو۔ لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہو۔ بلکہ اُسکا کام یہ ہے کہ ہر ایک شئے کا جو پہلو اُسکے سامنے آئے۔ اور اُس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اُسکے دل کو بےچین کردے اُسکو اُسیطرح بیان کرے پھر جب دوسرا پہلو دیکھکر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اُسکو اُس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تاکہ اُسکو حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے۔ بلکہ جسطرح ایک فوٹوگرافر ایک ہی عمارت کی کبھی رو کار کا۔ کبھی پچھیت کا۔ کبھی اس ضلع کا اور کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اُتارتا ہے۔ اسیطرح شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے۔ پس ممکن ہو کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت۔ اور ممکن ہو کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بُری چیز کی تعریف۔ کیونکہ خیر محض کے سوا ہر خیر میں شر کا پہلو۔ اور شر محض کے سوا ہر شر میں خیر کا پہلو موجود ہے۔ عقل۔ علم۔ زہد۔ دولت۔ عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں۔ مگر شعرا نے انکی جا بجا مذمت کی ہے۔ اسیطرح دیوانگی۔ نادانی۔ رندی۔ فقر۔ ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں۔ لیکن شعرا انکے اکثر مدّاح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلہ میں اسلیئے کہ وہ اُستاد اور موجدِ فن تھے اپنے

تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے۔ اور کبھی اسلیئے کہ اسنے اُنکی دولت میں کسیقدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہی جو اُنکے پاس نہ تھی اپنے تئیں اُنپر ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی اسلیئے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دار الغرور و دار المحن ہی۔ اور کبھی اُسکی بڑائی وعظمت اسلیئے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعۂ آخرت ہی وہ ایک ہی گورنمنٹ کی کبھی اُس کی خوبیوں کے سبب سے ستایش کرتا ہے اور کبھی اُس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت۔ مگر وہ کبھی اُن حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اُسکے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے توگویا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہی۔ وہ ایک نادان بچہ کیطرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اُسکے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھکر لوگ متعجب ہوں۔ مگر جب تک شاعر کا سا دل اُن کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا اُن کے دماغ میں نہ ہو اُنکا تعجب رفع ہونا مشکل ہی۔

"بہ زیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را ۔۔۔ نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر"

یہ چند اصول جو اوپر بیان کیئے گئے اُنسے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے۔ کیونکہ جسطرح فوارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اُچھلتا ہے۔ اسیطرح نکتہ چینوں کی زبان۔ بند کرنے سے اور زیادہ کھُلتی ہے۔ دوسرے نکتہ چینیوں سے کان اسقدر مانوس ہوگئے ہیں کہ جسطرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا۔ اسیطرح مصنف نکتہ چینوں کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ پس اُن کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورتِ وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچہ میں یہ چند باتیں جتادی جائیں

ظاہر ہے کہ سویلزیشن جسکو شعر و شاعری کا قاتل کہا جاتا ہے اُسکا پرچھاواں اس مُلک پر بھی پڑنے لگا ہے۔ شعر جسکو مدرسہ* میں لیجانے کی اجازت نہ تھی اُسکو روز بروز زیادہ تر مدرسہ ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پُتلے جوق جوق اور فوج فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوقِ معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شُعَرا اُن کے نزدیک عقل و دانائی سے اُنپر شعر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حُدی خواں کی آواز اثر کرتی ہے۔ غرضکہ شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسی علامتیں موجود ہیں جنسے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیئے گُل ہونے والا ہے۔ نہ پُرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول بیان نہ کرنے ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی۔ اِسی لیئے **مقدمہ** میں مطلق شاعری پر کسیقدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اور چند باتیں جو خاص اِس مجموعہ سے علاقہ رکھتی تھیں وہ اب دیباچہ میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگر غور کیجئے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار۔ سرے سے شعر کہنے ہی کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

"آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست"

مگر مدبّر السموات والارض نے اس خرابۂ آباد دُنیا کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے رہیں دھوکے کو

---

* یہ اشارہ ہے اُس مشہور مقولہ کی طرف کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" ۱۲

حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں۔ اور جس کوشش و جانفشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے بودے اور کمزور جالے کے پورنے میں سرگرم رہتی ہے اسی کوشش و جانفشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور ناپائدار ہوائی عمارتیں چنتے رہیں یہاں تک کہ فنا ہو جائیں۔

" درکار خانہ کہ بنایش بغفلت ست   ہشیار زیستن نہ ز قانون حکمت ست "

" نَرُوحُ وَنَغْدُو لِحَاجَاتِنَا   وَحَاجَةُ مَنْ عَاشَ لَا تَنْقَضِي
وَيَسْلُبُهُ الْمَوْتُ أَثْوَابَهُ   وَيَمْنَعُهُ الْمَوْتُ مَا يَشْتَهِي
تَمُوتُ مَعَ الْمَرْءِ حَاجَاتُهُ   وَتَبْقَى لَهُ حَاجَةٌ مَا بَقِي "

ترجمہ ہم اپنے کاموں میں صبح شام سرگرم ہیں۔ اور جو شخص زندہ ہے اسکا کام ختم نہیں ہو سکتا۔ موت ہی اسکے کپڑے اتروائیگی اور موت ہی اس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اس کے ساتھ ہی مریں گی جب تک وہ زندہ ہے کوئی نہ کوئی خواہش اسکے ساتھ لگی ہوئی ہے ۱۲

قطعات

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط اک دانا نے کھینچکے یاروں سے یہ کہا
دیکھ لو ان میں جتنے ہیں خط کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی؟ جو بے ہاتھ لگائے دے یونہیں چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے۔ جتنے خط تھے بڑے اُٹھ کے دیا ایک اِک کو مٹا
جب نہ رہا وھاں پیشِ نظر خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھا اُٹھا کر آنکھ جدھر تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہے یارو بات کہتی قوم میں باقی جان ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اب آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں فضل و عشق کے ہمتا
منشیوں میں ایسے تھے بہت جن پہ کہ نازاں تھی انشا
شعر میں تھے استاد اکثر سحر بیاں اور نکتہ سرا

لیگئی اُن کو آخر کار بحرِ فنا کی موج بہا
اہلِ ہنر کا نام و نشاں قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زید و عمر بنے صاحبِ دیوان نامِ خدا
اب چاہو۔ اُستاد گنو یا ہمیں سمجھو تم یکتا
ہم ہیں وہی ناچیز مگر کَثَّرَنَا مَوْتُ الْکُبَرَا

شعر کی طرف خطاب

اے شعر دلفریب نہو تو تو غم نہیں پر تجھ پہ حیف ہی۔ جو نہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
حُسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہی بحرِ حقیقت کو موج خیز دھوکے کا غرق کرکے رہیگا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو
چُپ چاپ اپنے سچ سے کئیے جا دلوں میں گھر اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو
جو نابلد ہیں اُن کو بتا چور بن کے راہ گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو

بلد واقفِ راہ اور نابلد ناواقفِ راہ ۱۲

عزت کا بھید مُلک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر راہِ رحمت پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو نے نکل
بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بیقدریوں کے بعد
اسکے خلاف ہو تو سمجھ اُسکو شاذ تو

جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے۔ کر اُسپہ ناز تو

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف
طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے۔ ہوتی تھی سراسر حالی

اب۔ کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ
سر ہے سودا سے تہی۔ عشق سے دل ہے خالی

گر غزل لکھیے تو کیا۔ لکھیے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سو جھانے والی

آپ بیتی نہ ہو جو۔ ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی

ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لایئے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی

تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل۔ آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی

پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
"گربہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں — جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعیِ بلیغ — اسمیں ایک اپنا پسینا اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا — اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں — شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

بے تمیزیِ ابنائے زمان

از رہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا — ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم
جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ — تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونیکا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا — امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا — گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
مجھ میں اور تجھ میں مگر کرسکتے ہیں جو امتیاز — ہیں مبصر ایسے اس بازار نا پرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں — تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑتے ہیں ہم

ایک خود پسند امیرزادہ کی تضحیک

کہتے ہیں اک امیرزادہ کو — تھا خدنگ فگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیرزادوں میں — لازمی ہیں۔ وہ اسمیں بھی سب تھیں
گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی — اسپہ تھا خود پسند اور خودبیں

کچھ نہ تھا پر سمجھتا تھا سب کچھ | علم تیر و کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سنتے سنتے یاروں کی | ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں
الغرض ایک روز صحرا میں | جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
مشق تیر افگنی میں تھا مصروف | کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آ کے دیکھا جو اک ظریف نے حال | وجہ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
تیر جتنے کمان سے چھوٹے | پائے سب بے اصول و بے آئیں
جا کے بھوسے سے بھی نہ پڑتا تھا | تیر آماجگہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چھٹ کے سوئے شمال | ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی | رکھ کے بالائے طاق سب تسکیں
خاک تودے پہ جا کے ہو بیٹھا | لوگ کرتے رہے چناں و چنیں
ناوک انداز بولا چلا کر | کوئی تجھکو جنوں ہوا ہے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے | یا کہ دو بھر ہے تجھکو جانِ حزیں
عرض کی چارہ کیا ہے اس کے سوا | جبکہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے اِن بے پناہ تیروں کی | کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجھکو ہر چند کے کشش ہے حضور | امن کی اک جگہ ملی ہے یہیں

پولٹکل سپیچین

اے بزمِ سفیرانِ دوَل کے سخن آرا ہر خُرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے
ظاہر ہے نہ غصہ میں بیاں سے تری رنجش نہ لطف میں کچھ طرزِ بیاں اُس سے جدا ہے
ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سی شیریں اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اُس سے سوا ہے
گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں سفر کے اور سُنیے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانیے کیا ہے
کُھلتا نہیں کچھ اسکے سوا تیری بیاں سے اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے
تھے لب پئے اظہار یہ اب آکے کُھلا یہ انسان کو اخفا کے لیئے نطق ملا ہے

بدی کر کے نیکنامی کی توقع رکھنی

نامنصف و بے رحم تھا اک ضلع کا حاکم برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیت
جب دورہ کو اُٹھتا تھا تو دیہات میں جاکر تھا پوچھتا ایک ایک سے ازراہِ شرارت
ہیں پرگنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا کرتے ہیں ہماری وہ ستایش کہ مذمت
تھی اُسکی مثال ایسی کہ اک شخص بدآواز جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
گاتا تھا کھڑا ہو کے اور آواز کے پیچھے ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سُرعت
ہو۔ تاکہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری آواز خوش آیند و یا قابلِ نفرت

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا " زینت و اسباب پہ جو لوگ — اتراتے ہیں۔ اک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے"
حالی نے کہا " جنکو ہے اترانے سے نفرت — اترا کے وہ اسطرح نہیں ناک چڑھاتے"

سید احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں — بعض کے نزدیک توحید اُسکی حدِ تام ہے
ہی مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول — جو ہیں قائل اسکے اُنپر کفر کا الزام ہے
کیونکہ اِس سے ماننا پڑتا ہی اُس رحمت کو عام — جس سے غیر از اہل قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ " شر سے تیرے سب ایمن رہیں — بس مسلمانی و دیں داری اسیکا نام ہے
پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عند الفحول — کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اِسے وہ خام ہے
ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ — اور سب کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے
بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہی لباس — جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے
بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ — حصر کرنا ان تمام آرا کو مشکل کام ہے
مذہب منصور[8] ہے لیکن بیاں کرنا ضرور — جو مسلم آج کل نزدیک خاص و عام ہے
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر — سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

[8] اقوال مختلفہ میں سے جو قول راجح ہو اُسکو مذہب منصور کہتے ہیں۔

قرض لیکر حج کو جانے کی ضرورت

قریب موسم حج قرض لیکے اک دیندار
چلا بہ نیّتِ حج گھر سے سوئے بیت اللہ

کہا یہ اُس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت
کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ

کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز
وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بحالِ تباہ

نہ نان و نفقۂ فرزند و زن سے خاطر جمع
نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ

سُنا یہ۔ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
کہ روکتا ہے مُسلماں کو حج سے اے گمراہ

وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
نگین و خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے میہمانوں کی
پہُنچتے جو کہ ہیں طے کر کے برّ و بحر کی راہ

جنھیں فراغت و تنگی میں ہے اُسی سے اُمید
جنھیں سلامت و آفت میں ہے اُسی کی پناہ

وہ سُن کے بولا کہ ناخواندہ میہمانوں کو
اُمید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ

ذلیل ہوتے ہیں جو بن بُلائے جاتے ہیں
طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزّت و جاہ

یہ سُن کے شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر کہ کہیں
ہو مدعی نہ تجسّس میں یہاں کوئی ہمراہ

بلُا کے پاس پھر آہستہ اُس سے فرمایا
ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ

قدم پہُنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے
جوانِ خام کی وہاں تک نہیں پہُنچتی نگاہ

خدا کے حکم ہیں مبنی تمام حکمت پر
فتوح جن میں ہے دنیا و دیں کی خاطر خواہ

نماز و روزہ ہو۔ یا ہو طواف و عمرہ و حج
حصول جیسے کہ ہوتا ہے انسے قُربِ الٰہ

اِسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام — نہ جن میں چاہیئے محنت نہ کوشش جانکاہ
مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے۔ ورنہ — ہزاروں پھرتے ہیں محتاج سادہ لوح تباہ
یہ کہنے سُننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردا — وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا۔ حاصل ہے آزادی جنھیں — قدرداں اُنسے بہت بڑھکر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں — قدر آزادی کی جتنی ہمکو ہو اُتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا — بینوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم
تُعْرَفُ الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم — دیگا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سُن کے ایک آزاد نے یہ لاف چُپکے سے کہا — ہے سقرِ موری کے کیڑے کے لیئے باغِ ارم[8]

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں "آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس — یہاں غلام آکر۔ کرامت ہے یہ انگلستان کی
اُس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہیں رکھا قدم — اَور گئیں کٹکر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی"
قلب ماہیّت میں انگلستان ہے گر کیمیا — کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد یہاں آزاد رہ سکتا نہیں — وہ رہے ہوکر غلام۔ اسکی ہوا جنکو لگی

8 یعنی جسطرح موری کے کیڑے کو موری ہی میں آرام ملتا ہے اور وہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا اسیطرح جو قومیں ہمیشہ محکوم رہتی چلی آئی ہیں وہ غلامی ہی میں خوش رہتی ہیں

سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ
کس لیئے سیّد سے صاف سے حضرت والا نہیں

کافر و ملحد ہمیشہ اسکو ٹھیراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اُسکا نزدیک آپ کے گویا نہیں

آپ بھی (نام خدا) ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ
اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں

خود نبوت پر سُنے ہیں ہمنے ایراد آپ کے
اور اُلوہیت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں

چشم بد دور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب وسیع
پھر یہ سیّد پر تبرّا آپ کو زیبا نہیں

سُن کے فرمایا "اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہے سُن لو صاحب تم سے کچھ پردہ نہیں

رنج کچھ اسکا نہیں مجھکو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

قحط اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشم پُر نم اپنا تھا یا پرایا

دُنیا سے اُٹھ گئے سب جتنے مرید صادق
یہ کہکے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا

ہمنے کہا مریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہکے ہم بھی روئے اور اُسکو بھی رُلایا

نوکروں پر سخت گیری کرنیکا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگذر تھی اور نہ ساتھ اُن کے عنایت تھی کہیں

بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف — کام سے مُہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
حسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار — ذکر کیا۔ نکلے جو چھوٹے مُنہ سے اُسکے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ ہوتے تھے جب اُس سے دوچار — نتھنے پھولے۔ مُونہ چڑھا۔ ماتھے پہ بل ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیئے کوئی فتوح — آکے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
رہتا تھا اِک اک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس — فرض جسمیں نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار — زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں
حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں — تا کہ یہ درخواست۔ دیکھیں واجبی ہے یا نہیں
وہاں سوا تنخواہ کے۔ تھا جس کا آقا ذمہ دار — تھیں کریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمہ تھیں
دیکھکر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب — تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں
ایک دن آقا تھا اک مُنہ زور گھوڑے پر سوار — تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں
دفعتہً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار — اور گرا اسوار صدر زیں سے بالائے زمیں
کی بہت کوشش۔ نہ چھوٹی پانو سے لیکن رکاب — کی نظر سائیس کی جانب۔ کہ ہو آکر مُعیں
تھا مگر سائیس ایسا سنگدل اور بے وفا — دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں
دور ہی سے تھا اُسنے کاغذ دکھا کر کہہ رہا — دیکھ لو سرکار اسمیں شرط یہ لکھی نہیں

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے — اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب

کہ نیشن وہ جماعت ہے کم از کم — زباں جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اسے بعضوں نے دی ہے — نہیں جو رائے میں اپنی مُذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی — کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب
زباں اِس کی نہ ہو مفہوم اُس کو — ہوں آدم تک جُدا سب کے جَد و اَب
جو وحدت لاشریک اِس کا خدا ہو — تو لاکھوں اُس کے ہوں معبود اور رَب

صفائی نہ رکھنے کا عذر

راہ سے گذرا کہیں میلا کچیلا اک غلام — اُس کے میلے پن پہ لوگوں نے ملامت اُسکو کی
عرض کی "ایک اک رُواں ہو جس بدن کا مِلکِ غیر — اختیار اُسکی صفائی کا نہیں رکھتے رہی" غلام ۱۲
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال — عذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونکہ جسمِ آدمی ہیں پیشِ اہلِ معرفت — کوئی چیز اُسکی نہیں سب ہے امانت گور کی

دلّی کی شاعری کا تنزّل

اک دوست نے حالی سے کہا از رہِ انصاف — "کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اُسکے سخن کو"
چند اہلِ زباں جن کو کہ دعوے تھا سخن کا — بولے کہ "نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے — ہو چھو نہ گئی غیر زباں اُس کے دہن کو
معلوم ہے۔ حالی کا ہے جو مولد و منشا — اُردو سے بھلا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو

اُردو کے دھنی وہ ہیں جو دلّی کے ہیں روڑے — پنجاب کو مَس اُس سے۔ نہ پورب نہ دکن کو
بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے — کیا عالمِ گلشن کی خبر زاغ و زغن کو
حالی کی زباں گر بمثلِ شیرِ لبَن ہو — خالص نہو تو کیجئے کیا ایسے لبَن کو
ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ — پہنچے گا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو
مانا کہ ہے سب بے ساختہ پن اُسکے بیاں میں — کیا پھونکیئے اِس ساختہ بے ساختہ پن کو
یہ دوست نے حالی کے سُنی جبکہ تعلّی — حق کہنے سے وہ رکھ نسکا باز دہن کو
کچھ شعر تھے یاد اُنکے پڑھے اور یہ پوچھا — کیوں صاحبو عزّت اسی اُردو سے ہے فن کو
سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے — کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے — پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیّت کے زمانہ میں یہ تھی رسم عرب — کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ اُسے گود سے لیکر ماں کی — گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جاکر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن — جو کہ اندھے ہیں ہیئے کے نہیں کچھ اُنکو خبر
لوگ بیٹی کے لیئے ڈھونڈھتے ہیں جب پیوند — سب سے اوّل اُنھیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر
ایسے گھر بیاہیئے بیٹی کو جو ہو آسودہ — اور رمہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانے کے سارے زن و مرد — اُنکے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر

ایک ہی شہر میں ہوں دونو گھرانے آباد / دونو۔ نزدیک قرابت میں ہوں باہم دگر
جیتے جی مر گئی بس اُن کی طرف سے گویا / جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر
چھان بین اسکی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہے / پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر
بدمزاجی ہو۔ جہالت ہو۔ کہ ہو بدچلنی / کچھ بُرائی نہیں۔ ذی تونتا ہو داماد اگر
وہ یہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن / بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر
جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں / گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی / زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر
اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام / جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے / برسوں رہا تلاش میں وجہِ معاش کی
وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا / لیکن نہ اُسکے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی / تدبیر یہ بھی اُسکی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اُسنے کیئے سیکڑوں جتن / پر کی کہیں نصیب نے اُس کے نہ یاوری
راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت / اک خضرِ پے خجستہ نے کی آکے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اُسکے کہ آج کل / سنتا ہوں چھپ رہی ہیں تصانیفِ احمدی
جا۔ اور لفظ لفظ کو اُسکے چھیڑ کر / تردید اُسکی چھاپ کہ جو ہو بُری بھلی

پھر دیکھنا کہ رس وچپ گرد و پیش سے لگتی ہے کیسی آ کے زر و سیم کی جھڑی

دنیا طلب کو چاہیئے ابلہ فریب ہو دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا

جی میں ترے ہزاروں گذرتے ہیں وسوسے ہوتی نہیں قبول تری ایک اگر دعا

تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا

وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر گو حاجت اس کی اُن سے ہوئی ہے نہ ہو روا

آتا نہیں یقین میں اُس کے کبھی قصور امید اُس کی روز فزوں ہے اور التجا

تو بندۂ غرض ہے۔ وہ رضی رضا پہ ہے وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندۂ خدا

استفادہ

لیجئے بھیک دوڑ کر۔ گر ہے گداگری کا یہ جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے

ہے یہی اصل اکتساب۔ ہو جیئے سب سے مستفید زک ملے۔ یا سزا ملے۔ درس ملے۔ ادب ملے

لایق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے

فائدہ اٹھا سکتے ہیں

قول ایک حکیم کا ہے کہ گر غور کیجئے ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر

اول تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو — اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب — سو سو طرح سے وہ اُسے کرتا ہے جلوہ گر
دشمن سے بڑھکے کوئی نہیں آدمی کا دوست — منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال — رکھتا ہے جو کہ دوست کے عیب اُس سے مستتر
گو قول ہے متین یہ جو تھی سخن کی تہ — افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ وہاں نظر
دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید — عیب اُنکے دوست کیوں نہ جتائینگے بےخطر
اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب — وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہونگے بہرہ ور
جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یہاں — موقوف عبرت اُنکی نہ دشمن نہ دوست پر

سخن سازی

ہے مردِ سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز — پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اُسکو
موجود سخنگو ہوں جہاں وہاں ہیں طبیب آپ — اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخنگو
دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ — پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں (مغلوب ہارا) — اپنے دعووں پہ بیاں کرکے دلیل و برہاں

8 عبرت و اعتبار نصیحت حاصل کرنا ۱۲

کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی
درد ہیں تیرے۔ اسی واسطے سب بے درماں

ہی غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
جسکا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں

سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز
تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں

نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
یہ بھی ہے نیند کوئی۔ موت کا ہی جسپہ گماں

نہ جوانی میں تجھے صبر۔ نہ پیری میں شکیب
کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں

کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو
دیکھ۔ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہی کہاں

ہاتھ دھو لذتِ فانی سے۔ نہیں گر منظور
عیش باقی و حیاتِ ابدی سے حرماں

نفس نے عقل سے کی عرض کہ ای خضرِ طریق
وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجئے جاں

پر نہیں حکم ترا کوئی۔ عمل کے قابل
گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہی بیاں

نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی امید
کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں

ہی یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا
سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جسپر قرباں

ایک اب بھوکے سے کہتا ہے کہ لے قابِ طعام
ایک وعدہ اُسے کرتا ہے پس از سال رواں

کیونکہ امید پہ اک مائدۂ نعمت کی
سال بھر صبر کرے گرسنگی میں انساں

عقل نے سن کے کہا خوف ہی تجھسے ای نفس
تجربہ تیرا تجھے دیکھئے پہنچائے کہاں

حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں باطل سرسبز
کیجئے لاکھ بیاں اُسپہ دلیل و برہاں

جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالفرض اگر
زہر دانستہ کرے نوش۔ نہیں یہ امکاں

نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمۂ نقد
اسکے کھانے میں نہیں جاں کی خیر ای ناداں

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط ہیں نے عادت سے کہا گھیر لی عقل صواب اندیش کی سب تو نے جاے
ہنسکے عادت نے کہا کیا عقل ہو مجھسے الگ؟ میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و راے

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہو رائے — "چاہیے گر رونق علم زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجیے رکن — جن پہ اسکی سب ارکانیں ہیں عیاں"
رائے صائب ہی بظاہر او رتمیں — گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ — ہی بہت کم برخلاف اِسکے گماں
سلطنت کا پر خدا حافظ ہے جب — شاعروں کے ہاتھ ہو اُس کی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے — شعر و انشا کو بھی ہے خوفِ زیاں
ایک پر اُن میں سے چل سکتا نہیں — دوسرے کا جادوے حسنِ بیاں
ایک جب چلنے نہ دے گا ایک کی — پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

لوگ کسی کی خوبیاں سُن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اُسکے عیب سُن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنون حالی — اُسقدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گزار

لوگ جب عیب ہمارا کوئی سُن پاتے ہیں — گو کہ کرتے ہیں تاسف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو سچ اُن کو کمال — گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار
اور جو ہو گوش زد اُن کے کوئی خوبی اپنی — خوش تو پڑتی ہے بنانی اُنھیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم اُنکے — کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار
للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا — نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ طیار

شایستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اک فقیر کی کرتا تھا جب سوال — انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا
مدت تک اُسکی جب یہی دیکھی گئی روش — پوچھا کسی نے اُس سے کہ اِسکا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اسلیئے کی ہے یہ اختیار — چھُٹ جائے تاکہ مجھسے یہ لپکا سوال کا
پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک — آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار — منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا
امید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت — گر چند روز اَور رہا اِن سے سابقہ
آیا جواب سُن کے یہ اُسکا بہت پسند — کی آفریں اور اُس سے مخاطب نے یوں کہا
نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ — حق میں ترے مفید ہیں یہ اُنسے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل — اہل وطن پہ اُن کی مگر جان ہے فدا
پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ — دل بھائیوں پہ بھی نہیں اُن کا پسیجتا

انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا
اہلِ غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ شایستگی کا زہر ہے جب سے انھیں چڑھا

اسراف

ایک مُسرف نے یہ ممسک سے کہا کب تک اے ناداں یہ حُبِّ مال و زر
تو۔ جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ ہے سدا دنیا ہی میں رہنا مگر؟
ہنسکے ممسک نے کہا اے سادہ لوح زر لُٹانا رائگاں اور اسقدر؟
آج ہی گویا (نصیب دشمناں) آپ کا دنیا سے ہے عزمِ سفر

پاسِ نیکنامی

اے نیکنام شکر کر اللہ کا ادا جسنے بنایا نیک تجھے کر کے نیکنام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نامِ نیک کا پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھکو خوفِ خدا کا ہو اسقدر جتنا کہ خوفِ طعنہ و تشنیعِ خاص و عام

غرورِ نیکنامی

گئی ہے حد سے گذر شیخ کی نکو نامی گمان بد کبھی اُس کی طرف نہیں جاتا
جو اُسکے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی خود اُسکو عیب کا اپنے یقیں نہیں آتا

کالے اور گورے کی صحت کا مڈیکل امتحان

دو ملازم - ایک کالا اور گورا دوسرا　　دوسرا پیدل - مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونو رواں　　کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
راہ میں دونو کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت　　کوکھ میں کالے کی اک مُکّا دیا گورے نے مار
صدمہ پُہنچا جس سے تِلّی کو بہت مسکین کی　　آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اُسکو اُتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی　　چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونو پیش و پس　　ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونو کی سُنی جب سرگذشت　　تہ کو جا پہنچا سخن کی سُن کے قصہ ایکبار
دی سند گورے کو لکھ - تھی جسمیں تصدیقِ مرض　　اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مُکّے سے مرے　　کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے "تم کو مل نہیں سکتی سند　　کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا اپٹ کے جو گورے سے فوراً مر نجائے　　آئے بابا اُس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

خود ستائی

اے دل بشر وہ کون ہے جو خود ستا نہیں　　پر - خود ستائیوں کے ہیں عنواں جدا جدا
جو زیورِ خرد سے معرّا ہیں سادہ لوح　　کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا

جو اُن سے تیز ہوش ہیں۔ سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں ہی مضمون کو ادا

کہتا ہی ایک کیسی حماقت ہوئی ہی آج
کمبل تھا ایک گھر میں۔ سو سائل کو دیدیا

کہتا ہی دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈب میں میں نے دیا مال جب دکھا

پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے بخل یہ
اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وہ سخا

کچھ۔ اسلئے کہ ہم بھی اُنھیں میں سے ہوں شمار
اہل وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا

کچھ۔ اسلئے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا

کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے بُرا کوئی
ہی عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا

کہتا ہے ایک گر ہے خوشامد کا اور ہی
پر جانتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم بُرا

دھوکا ہنر کا دیکے چھپاتا ہے عیب یہ
اور مونہہ سے دُرد کہکے دکھاتا ہی وہ صفا

چُپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنے کہ یہ بیان ہی سب رست اور بجا

کہتا ہی اسپہ کوئی کہ سب حسن ظن ہی یہ
اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا

قانع ہی وہ اُنھیں پہ۔ ہوئی ہو وصف جو بیاں
اور چاہتا ہی یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہی زید۔ عمرو ہی شدت سے سادہ لوح
گنتا ہی سب کو نیک وہ۔ اچھا ہو یا بُرا

کہتا ہی عمرو۔ زید بھی کتنا ہی عیب بیں
بد ہو کہ نیک۔ اسکی زباں سے نہیں بچا

یہ اُسکا اور وہ اِسکا بیاں کرکے کوئی عیب
ہر اک ہی اپنی اپنی بڑائی نکالتا

غیبت۔ اُمید ہی کہ نہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پُتلا نہ خود ستا

حالی۔ جو پترے کھول رہے ہیں جہان کے
شاید کہ اِس سے آپ کا ہوگا یہ مُدّعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب — اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا
القصہ جسکو دیکھئے - جاہل ہو یا حکیم — آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مبتلا

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے — گر کبھی حملہ پہ اُسکے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی — جن کو نادانی سے حملے اُسکے ٹھیراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیئے سب عقل نے ہتھیار ڈال — زور بازو پر ہمیشہ جسکے اتراتے تھے ہم

جس قوم میں افلاس ہو اُسمیں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا — جب کرتے ہو تم کرتے ہو مُسرف کی مذمّت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور — جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
اسراف بھی مذموم ہے - پر بخل سے کمتر — ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اس کا — یاروں کے لیئے ہے یہ بیاں موجبِ رقّت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُسوقت — جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر — پھر اُسمیں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال — گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی — پرواز کی ہے چیونٹوں کو جیسے ہدایت

رُؤسائے عہد کی فیاضی

کی رئیس شہر کی تعریف یاروں نے بہت — بر سبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا

بولے آج اُس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر — عاملانِ شہر مدعو اُسکے رہتے ہیں سدا

ضلع کے حکام کا ادنےٰ اشارہ چاہیئے — پھر کوئی دیکھے سخاوت اُس کی اور بذل و عطا

یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی بنیں — اُنمیں صرف اُس کی رقم ہی سب کے چندی سے سوا

پالکی یا ویگنٹ۔ ہو جو سواری اُسکے پاس — اہلکاروں کے لیئے ہی وقف بے چون وچرا

کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس — اُس کی ہمت کے ہیں سب مدّاح بے رُو و ریا

جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام — جوڑ کر ہاتھ۔ اُنسے حالی نے بصد منت کہا

چپ چپاتے آج [illegible] — سُنتے سُنتے [illegible] اکتانے لگا

عیب بھی اُس کا کوئی [illegible] یاد ہو بیاں — [illegible] خوبیاں [illegible]

ایمان کی تعریف

فقیہ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف — تو دی چراغ سے اُسکو بہ آب و تاب مثال

کہا "فتیلہ اقرار باللساں ہی ضرور — جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال

کہا کسی نے کہ نکلا ہی ان دنوں اک تیل[8] — نہیں ضرور فتیلہ کا جسمیں استعمال

8 یعنے کروسنو آئل جو بغیر بتی کے بھی جل سکتا ہے۔ گویا مجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے ۱۲

برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اک آزاد کہ ہے جنھیں ملاپ — دولت و بخت ہے ہر حال میں اُنکے ہمراہ
نہ اُنھیں حاجتِ اعواں۔ نہ تلاشِ انصار — نہ اُنھیں خوفِ بداندیش نہ بیمِ بدخواہ
پر نہیں ربط جس قوم میں اور یکجہتی — اُسکی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزّت و جاہ
نہ ملاذ اُنکے لیئے قلعہ نہ خندق نہ فصیل — نہ مفید اُنکے لیئے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک مُلّا نے سُنا جب یہ سخن فرمایا — تکیہ اور اعتقادِ اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں — دستِ قدرت کے ہی سب ہاتھ سفید اور سیاہ
وھاں نہ ملّت کی ضرورت ہی۔ نہ کچھ پھوٹ کا ڈر — پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر — کردیں افرادِ پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہی اللہ کی عادت معلوم — اُسکو جب دیکھا ہے۔ دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

بُعدِ صوری مانعِ قربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیئے شہر میں اک گھر — جا اپنے محلّہ سے کہیں دور بنایا
جب اہلِ محلّہ سے چلا ہو کے وہ رخصت — دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا
ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس — اک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
بلّی کہ جو بے عقل ہے۔ دم دیتی ہے گھر پر — اتنی بھی محبت تمھیں گھر سے نہیں آیا؟

حالی نے کہا "انس ہی چیز اَور، وفا اَور
بلّی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا
اس مہر و وفا کی نہیں بلّی پہ پڑی چھینٹ
کُتّے نے ہے جس کا کہ سبق ہمکو پڑھایا
ہم غش ہیں مکینوں پہ، وہ عاشق ہیں مکاں کی
گھر بھول گئے ہم تو نہیں اُسکو بھلایا
گھر دل میں ہے یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر
مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا"

ناصح مخلص اور اہلِ غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفرِ صادق سے عرض کی
"محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور"
فرمایا "ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرفِ نصیحت زبان پر
اور جنسے ہے امیدِ نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کرینگے تری حذر"

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خُدّام ماموں کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
"کوئی آقا جبکہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت
پیش خدمت اُسکے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا
پر، جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم
ہے دلیل اسکی کہ ہے خود خُلق آقا کا بُرا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جسنے اور تمکین کو
اُسنے گویا ڈھا دیا رُکن رکیں اخلاق کا"

خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکل کا تیر چڑیا پر ہو گیا اتفاق سے جو خطا
ابن حمدوں ندیم تھا حاضر کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
"جن کو خلق خدا پہ شفقت ہے خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
جا نہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ تو نے دی قصداً اسکی جان بچا"
ابن حمدوں نے کی یہ دانائی کہ خوشامد سے یوں اسے تھپکا
دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا
جانے کنجشک ابن حمدوں پر تیر کا اپنے امتحاں کرتا
ابن حمدوں کی جان گو جاتی دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

رعیت پر نا اہل کو مسلط کرنا

ہاروں نے کہا مصر لگا ہاتھ جب اسکے فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز چلایا
وہ خطۂ ملعوں تھا یہی جسکی بدولت تھا دل میں خدائی کا خیال اسکے سمایا
ہم بھی اسے اس باغی و طاغی کے علی الرغم اک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خصیب ایک غلام حبشی تھا جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنتِ مصر کی باگ اسکے حوالے نا اہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا
باڑہی گئی بہ ایک برس نیل کی رو میں یہ حادثہ آ اسکو کسانوں نے سنایا

فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اون — ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اُٹھایا
ہارون نہ سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی — محکوم ہے جو میری رعایا و برایا
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا — اپنے کو خدا جسنے ہے عالم کو بنایا
جو کھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی — اک سفلہ ناکس کی بنا اُسکو رعایا

رشک

ظاہر امر [illegible] کہ طینت میں نہیں رشک بقدر — ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں
ایک شہزادی۔ کہ اکلوتی تھی جو [illegible] باپ کی — [illegible] بعد از پدر مسند نشیں
سلطنت میں اُسکی۔ تھا مردوں کو کلی اختیار — عورتیں اصلا دخیل اُ[illegible] کی حکومت میں تھیں
مرد ہی تھے اُسکے محرم۔ مرد ہی اُسکے مشیر — تھا نہ عورت کا پتا دربار میں [illegible] نہیں
تخلیہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم — ہنسکے فرمایا کہ "اے دولت کے ارکان [illegible]
مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں — بلکہ ہے اُنس اسلیئے تم سے کہ تم عورت نہیں"
بات کی حسن بیاں سے اُسنے دی صورت بدل — تاکہ کوئی سوء ظن اُسپر نہ کر بیٹھے کہیں
ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے — اسلیئے نفرت کہ ہے مردوں کی [illegible] دل نشیں

قانون

کہتے ہیں فرد الناس پہ ہے فرض — ماننا قانون کا بعد از خدا

پر جو سچ پوچھو۔ نہیں قانون میں — جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا
اُس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں — اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا
پر اُسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں — جو سکت رکھتے ہیں ہاتھو نمیں ذرا
حق میں کمزوروں کے ہی قانون وہ — اور نظر میں زورمندوں کی ہو لا

لیکن کچھ بھی لا انہی بانی اسکا بھی قانو

شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو — تختِ پدر پہ اُسکو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ اُن مقنّنوں نے — عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی — کہتے ہیں وہ عبث ہی قانون یہ بنانا
نزدیک اُنکے گویا بر زعم عقل و دانش — ہے کنگڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

حرص

اُنکے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ — قدرِ قلیل ہے سب مال و منالِ دنیاؔ
گویا کہ حرص اُسکی اس سے بجھی نہیں ہے — ہے جسقدر فراہم پاس اُسکے مالِ دنیا

اُمرا اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خردمند — وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت

پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت
بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ طبا بیمار کو کچھ اس سے سوا اُن کی ہے حاجت

عصمتِ بی بی از بے چادری

اے بےنواؤ ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم اخلاق میں کچھ اُن کے اگر آ گیا بگاڑ
تم زَد سے نفس کی ہو جبھی تک بچے ہوئے ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے مفلسی کی آڑ
اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش گر تم کو ہوں نصیب تو دنیا کو دو اُجاڑ

سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار لگے دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

جھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ بازپرس اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آ آ کے جو لوگ تمھاری ہر دم اے اربابِ دولت

خوشامد پر نہ اُن کی بھولنا تم وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہمنے بیاں کیں خصلتیں نیک نہیں ان میں سے تم میں ایک خصلت

تدبیرِ قیامِ سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح وھاں پانو جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اِسکے تھی یہ مشورہ دیتی یہ حرفِ سبک بھول کے مونہ سے نہ نکالو
پیرِ رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر مانو اُسے۔ اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو۔ لیکن جو بات سبک ہو اُسے مونہ سے نہ نکالو

مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر مردوں کی حکومت میں ہے ملکوں کی بُری گت
لیکن بخلاف اسکے۔ ہے عورت کا جہاں راج وھاں ملک ہے سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاں دار قبضہ میں ہے وھاں عورتوں کے دولت و ثروت
اور سر یہ ہے عورت کے جہاں افسرِ شاہی سمجھو کہ ہے اُس مُلک میں مردوں کی حکومت

مغرور کی پہچان

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو تو سمجھو۔ کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار

جنھوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا
بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

کام اچھا کرنا چاہیئے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اُسنے کی تاخیر اُسنے جسقدر اچھا کیا

کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

گدائے مبرم

اک برہمن مورتی کے سامنے با صد نیاز
مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دعا بیٹھا کہیں

آن نکلا باولا اک مانگتا کھاتا اُدھر
دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں

جی میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے
تاکہ پوچھے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں

مورتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا
باولا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں

مورتی کچھ تجھکو دے گی اور نہ دیسکتی ہے وہ
ناحق اتنی التجائیں اُسکے آگے تو نے کیں

ہنسکے برہمن نے کہا ہے مانگنا بندہ کا کام
دے۔ نہ دے وہ۔ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں

ہم نہیں دیتے ڈھٹی تم جیسے ڈھیٹوں کی طرح
ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پانو پھیلاتے نہیں

بے اعتدالی

تم اسے خود پرستو طبیعت کے بندو
ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کر

نہیں کام کا اُنکو اندازہ ہرگز　　جدھر ڈھل گئے، ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت　　تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اُٹھو نہ جبتک　　کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر　　تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو　　کہ بس ٹھن گئے عزمِ جنگِ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر　　تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہو تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو　　کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی　　رہیں پانو کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو اَت گَت　　غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمہ سے ہوتا ہی ہر بشر کو ملال　　کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے　　تو اور بھی اُسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہی کہ ہوتے نہیں طبیب ملول　　جو چل بسے کوئی اُنکے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ چھُپ جائیگی خطا ہم پر　　کیا ملال کا اپنے گر ہجگہ اظہار

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

یعنی پیٹ بھر کے احمق۔ احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں گویا مخاطب کے سوا کسی پر اُسکی حماقت ظاہر کرنی نہیں چاہتے ۱۲

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی — پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اُس سے کارنمایاں کوئی اگر — کرتا ہے بار بار بیاں اُسکو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیئے — ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اک جدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اُسکو یاد — یاروں سے میں بیان ابھی کرچکا ہوں کیا
بھُولے نہ اپنی یاد یہ انساں کو چاہیئے — آخر بشر کا خاصہ ہے سہو اور خطا

فضول خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اک گدائے ظریف — جہاں سے ہوکے گذرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش — سخی ہو آہیں کہ مُمسک غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولتمند — کہ جسکا تھا کوئی اسراف میں نہ شبیہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اُس راہ سے گذر اُسکا — درم اک اُسنے بھی چاہا کہ کیجیے نذرِ فقیر
کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت — کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر
پہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار — کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اللّلے تللّلے رہے تو آپ کو بھی — ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہی یہی لینے کا خوب دولت سے — دکھائے دیکھیے پھر اسکے بعد کیا تقدیر

اختلاف مذاہب رفع نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اُٹھ جائے دلیل و بحث سے — جو چلا آتا ہی باہم اہل مذہب میں خلاف

ہو نہیں سکتا سطابق جبکہ دو گھڑیوں کا وقت　　رفع ہو سکتے ہیں پھر کیونکر ہزاروں اختلاف

انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ مورد آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار　　دو ہیں اُنمیں سے نہایت جانگزا
ایک فکر اُس آنے والے وقت کی　　شک نہیں ہے جسکے آنے میں ذرا
دوسرے چوٹیں زبان خلق کی　　زخم جن کا زخم ہے تلوار کا
اور بھی حیوان ناطق کے لیئے　　ہیں بہت سی زحمتیں اِنکے سوا
پر گدھے اور اَور حیوانات سب　　رہتے ہیں دور ان گزندوں سے سدا
کیسا اِن آلام سے رہتا نچنت　　اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

چنڈو بازی کا انجام

ایک متوالے سے چنڈو کے وہ تھا شوقین جب　　پوچھا ناصح نے کہ اسکام کا آخر انجام ہے؟
بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم　　زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام
آنکھ میں اپنے پرائے کی ٹھہرنا بے قدر　　شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام
جس سے عقبیٰ ہو درست ایسا نہ ہونا کوئی بیج　　جس سے دنیا میں ہو نام ایسا نہ کرنا کوئی کام
ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا　　نفس سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام
کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر　　لے نہ اس زہر ہلاہل کا کوئی بھول کے نام

یہ تو کہتے ہو کہ انجام برا ہے۔ لیکن   یہ بتاؤ کہ برا ہوتا ہے کیسا۔ انجام؟
برے انجام کی تب ہوگی حقیقت روشن   برے انجام سے جب آکے پڑیگا خود کام
مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم   گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

قوم کی پاسداری

اک مسلمان خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں   پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کسقدر
چاہتے ہیں۔ نفع پہنچے اپنے اہل ملک کو   گو کہ اُنکے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہ ہے اب جس کے کبھی چاکو نہ لیں   اُسکا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یہاں سے لینی پڑتی ہیں انھیں   اُنکو لندن سے منگائیں بس چلے انکا اگر
الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ   جانتے ہیں دین و ایماں اپنا۔ قصہ مختصر
سُن کے حالی نے کہا "ہے حصر انگریزوں پہ کیا   ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی   یہ وہ خصلت ہے کہ مجبول اس پہ ہے طبع بشر
مکھیاں جیتی نگلجاتے ہیں پاس قوم میں   اچھے اچھے راستباز اور حق پسند اور دادگر
ہاں۔ بری اس عیب سے دیکھے ہیں دنیا میں ہے   چشم بد دور امت مرحوم اے جان پدر
اور قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز   حملہ جب کرتے ہیں یہ۔ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہوگا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یہاں   جسقدر ہے انسے اپنوں اور یگانوں کو خطر

غزلیات قدیم و جدید

چونکہ بہت سی ردیفیں قدیم غزلیات میں اور بہت سی جدید غزلیات میں نہیں تھیں۔ اسلیئے ہر ایک ردیف میں دونوں قسم کی غزلیں ملا جلا کر لکھدی گئی ہیں۔ اور تمیز کے لیئے ہر قدیم غزل کے شروع میں حاشیہ پر حرفِ ق لکھدیا گیا ہی تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ قدیم جدید غزل میں کیا فرق ہے

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا — اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا
گو سب سے مقدّم ہے حق تیرا ادا کرنا — بندے سے مگر ہوگا حق کیونکہ ادا تیرا
محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم — کچھ کہہ نسکا جسپر یہاں بھید کھلا تیرا
چھپتا نہیں نظروں میں یہاں خلعت سلطانی — کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

قطعہ

۱ عظمت تری مانے بن کچھ بن نہیں آتی یہاں — ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا
۲ تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط اُن کو — جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا
۳ نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بیخود — جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا
۴ سمجھا ہے پرے تجھکو ادراک کی سرحد سے — جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا
۵ طاعت میں ادب تیرا عصیاں نسے ہی گو بڑھکر — عصیاں میں ہی طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری — گھر گھر لیئے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گذرتا ہے
کچھ رنگِ بیاں حالی ہی سب سے جدا تیرا

---

* یہ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف "اَلَا اِنَّ لِلّٰہِ نَفَحَاتٍ فِی الدَّهْرِ اَلَا فَتَعَرَّضُوا لَهَا" یعنی خدا کی خوشبوئیں زمانہ میں پھیلی ہوئی ہیں سو اُنکا آگا لو اور انکو اپنے اوپر پڑنے دو ۱۲

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا　　باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ　　ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی دُگدا میں ہی طبیعی　　جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی۔ پر دل بندھے ہوئے ہیں　　ملنے سے بھی سوا ہے چھُٹنا محال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یہاں ٹالتے رہے ہیں　　لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی　　پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
اُنکی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی　　آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
دل ہو کہ جان۔ تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے　　دل ہے سو چیز تیری۔ جاں ہے سو مال تیرا
ہے پور زال سے دل اُس کا قوی زیادہ　　رکھتی ہے آسرا یہاں جو پیرزال تیرا
ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی　　یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سُن سُن کے سر دُھنینگے قال اہلِ حال تیرا

ربڑ میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اس سفر میں تکان دیکھی نہ اِس نشے میں خُمار دیکھا
نہ جی رُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یہاں اُنھیں بھی امیدوار دیکھا
رخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں

نہ بلبل و گل میں وھاں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا
سوارِ محمل کی جستجو میں ہزاروں دشتِ طلب میں دوڑے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اُٹھتا غبار دیکھا
جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھُلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اُس کا پھر کسیکو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا
لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پر خطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کرکے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا
بچے ہوئے کاہشوں سے یھاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا
چمن میں بھُولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گل اُنکی نظروں میں چُبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا
خبر نہیں یہ کہ کیا ہے۔ کیسا ہے۔ کون ہے۔ اَور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اَور تجھ میں ہمنے علاقہ اک استوار دیکھا
سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہوں یا مسلماں
نہ اُنسے کچھ تیرا بیَر پایا نہ اِنسے کچھ تیرا پیار دیکھا
سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیئے ہاتھ باندھ سب کے
جنھیں تھا یھاں اختیار سب کچھ اُنھیں بھی بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بیکار تجھکو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا — چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا
مضموں ہی نقش دل ہیں لَدَیْنَا مَزِیْد کا — کونین سے بھریگا نہ دامن امید کا
قفل در مراد سب اکبار کھل گئے — چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا
دیکھا ہی ہمنے عالم رحمت کو غور سے — ہی شش جہت میں قحط دل ناامید کا
شرم کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں — انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا
ہی نردبان جذبۂ توفیق درمیاں — یہاں امتیاز کیا ہی قریب و بعید کا
ہی آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ — خون جگر میں نشہ ہی جام نبید کا
تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے — یارب یہ روزہ دار ہی مشتاق عید کا
دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر — لَا تَقْنَطُوْا جواب ہی ھَلْ مِنْ مَزِیْد کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لیگا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

نعت

یا ملکی الصفات یا بشری القویٰ — فیک دلیل علیٰ انک خیر الوریٰ
تجھسے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ بارانسے خاک — خلقک خصب الزمان بشک محیا الوریٰ

8 قرآن شریف میں ہی "لَهُمْ مَا يَشَاؤُنَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْد" یعنی اہل جنت کے لیئے جنت میں جو کچھ وہ چاہینگے سب کچھ ہوگا اور (اسکے سوا) ہمارے پاس کچھ اور بھی ہی ۱۲

دعوئے روشن ترا ثابت بے بیّنہ — صورت و سیرت تری صدق پہ تیرے گوا

قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور — اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

غیب سے بھیجا تجھے ٹاپتا پھرتا تھا جب — دشت میں بھٹکا ہوا قافلۂ بے رہنما

اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت — جیسے کہ ہنگامِ قحط قبلہ سے اُٹھے گھٹا

شانِ رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں — گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا

گلۂ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو — گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا

دوڑ پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں — انہوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا

رہب و قسیس و حبر رہ گئے دل تھام کر — دیکھ کے تیرا قدم مقدمِ انبیا

خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شرّ و فساد — تو نے اسی کو دیا ارضِ مقدس بنا

تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب — جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحّم کیا

چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت — تو نے کیا دام دام قرض سب ان کا ادا

تو نے کیا سرِّ حق عارف و عامی پہ فاش — ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا

چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی — ایک کے چرکا لگا ایک کو گھائل کیا

حجتِ حق کر چکا دین ترا جب تمام — پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما

دیر ہوئے بے چراغ اور صلوات یہود — شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا

بجھ گئے آتشکدے بیٹھ گئے بتکدے — ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا

دیر۔ راہبوں کا کلیسا۔ صلوات۔ یہودیوں کا کلیسا۔ ہبا۔ غبار ناچیز ۱۲ مجوسی جو دو خدا ایک خالق خیر اور ایک خالق شر یعنی یزداں اور اہرمن کو مانتے ہیں اس عقیدے کو ثنویت کہتے ہیں ۱۲

اُٹھے بہت مدّعی جیسے کہ ساون میں کھانس — مزبلہ پر چند روز پاتی ہے نشو و نما

غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام — مل گئے اُٹھ اُٹھ کے سب خاک میں اہلِ ہوا

رہ گیا نامِ سجاح کذب میں ضرب المثل — اسود و ابن کثیر خوار ہوئے بر ملا

سلسلۂ انبیا ختم نہ ہوتا اگر — حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اُٹھا

آتے ہی چشمہ دیا تو نے کوئیں سے نکال — جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا

بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ — بھیج چکا تیرے ہاتھ ملتِ بیضا خدا

تجھ پہ صلوٰۃ و سلام ربِّ سموات سے

روز و شب و صبح و شام قدر زیادہ رہے

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر سے سر اُٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا

اَبرار تجھسے ترساں اَحرار تجھسے لرزاں — جو زد پہ تیری آیا اُسکو گرا کے چھوڑا

رایوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے — گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ — جو گنج تو نے تاکا اُسکو لٹا کے چھوڑا

جس رہگذر میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر — صنعاں سے رہنما کو رستہ بھلا کے چھوڑا

فرہادِ کوہکن کی لی تو نے جانِ شیریں — اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوبؑ سے بشر کو دی تو نے ناصبوری — یوسفؑ سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

لاگ اور لگاؤ دونو ہیں دلگداز تیرے — پتھر کے دل تھے جن کے انکو رُلا کے چھوڑا

سجاح - ایک عورت مدعیہ نبوت کا نام ہے جسکا کذب عرب میں ضرب المثل ہے چنانچہ کہتے ہیں ھو اکذب من سجاح اور اسود عنسی اور مسیلمہ جسکی کنیت ابن کثیر ہے۔ یہ دونو بھی مدعی نبوت تھے جو آخر کار قتل کیے گئے ۱۲

عقل و خرد نے تجھسے کچھ چپقلش جہاں کی — عقل و خرد کا تو نے خاکا اُڑا کے چھوڑا

علم و ادب رہے ہیں دبتے ترے ہمیشہ — ہر معرکہ میں تو نے اُن کو ڈِلا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش — شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اِک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اُسکے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

دیکھ اے اُمید کیجو ہم سے نہ تو کنارا — تیرا ہی رہ گیا ہے لے دیکے اک سہارا

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے — اے آسماں کچھ اسمیں تیرا بھی ہے اشارا

میخانہ کی خرابی جی دیکھکر بھر آیا — مدت کے بعد کل وہاں جا نکلے تھے قضارا

اِک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے — اے زاہدو تمہارا ہے اسمیں کیا اجارا

دنیا کے خرخشوں سے چیخ اُٹھتے تھے ہم اول — آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا

توفیق نے ہمیشہ لی تنت پر خبر یہاں — جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے — جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا

افسوس اہل دیں بھی مانند اہل دنیا — خودکام و خودنما ہیں خودبیں ہیں اور خودآرا

اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر — اسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ — سب کچھ کہا اُنھوں نے پر ہمنے دم نہ مارا

حالی سے کام ہے یہاں فعلوں سے اُسکے کیا کام
اچھا ہے یا بُرا ہے پھر یار ہے ہمارا

٭ دِلانا رکشتی دِلانا یعنی پچھاڑنا۔ اکثر کشتی کا لفظ حذف کرکے صرف دلانا بولتے ہیں ۱۲

رونا نہ ہوگا حالیؔ شاید یہ کم تمھارا — جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمھارا

الفت میں دم بدم کچھ لذت ہی بڑھتی جاتی — چھوٹے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمھارا

عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ — ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمھارا

دلجو نہیں کوئی یہاں حیف اے صنم پرستو — دلکش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمھارا

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم — اپنی نظر میں ہوگا گر وزن کم تمھارا

دشتِ طلب کے رستو طے ہو گئے کس طرح تم — آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمھارا

دو بینوا آؤ انکو بھی کچھ جم کے جانشینو — بس جامِ جم ہمارا اور ملکِ جم تمھارا

روسی ہوں یا تتاری ہمکو ستائینگے کیا — دیکھا ہے ہمنے برسوں لطف و کرم تمھارا

کھولی ہیں تمنے آنکھیں اے حادثو ہماری — احسان یہ نہ ہرگز بھولینگے ہم تمھارا

ہوتے ہی تم تو بیدل کچھ رو دیے سوارو — ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمھارا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملوگے — گذرا ابھی ہے یہاں سے خیل و حشم تمھارا

پھرتے ادھر ادھر ہو کسکی تلاش میں تم — گم ہے تمھیں میں یارو باغ ارم تمھارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تمکو حالیؔ
کچھ کر کے بھی دکھائے زورِ قلم تمھارا

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا — پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خو وہ مہر وطن سے ہی وداع اب کے سفر میں — جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر — گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہوں وہ دن نہ دکھانا

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں
چھل بل ہیں تم اس زالِ فسونگر کی نہ آنا

افسوس کہ غفلت میں کٹا عہدِ جوانی
تھا آبِ بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھکے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سُنانا

دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جبدن ہو اسے چھوڑکے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا

ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمو تمسے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی۔ نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُسکو تصور اپنا نہ کیجیے گا

سُنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعوے
یہ۔ کہدو۔ دعوی بہت بڑا ہے پھر ایسا دعوی نہ کیجیے گا

اسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہمکو
کرے وہ یاد۔ اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجیے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو

زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

کمال ہے ضدِ بے کمالی۔ نہیں ملاپ انمیں حرف گیرو!

جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بےجا نہ کیجیے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ درد الفت کی آگ زاہد

پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا

تمھارا اتحاد دوستدار حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو

سلوک اُس سے کیئے یہ تمنے تو ہمسے کیا کیا نہ کیجیے گا

ہو عزمِ دَیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا — آتا ہے دور ہی سے ہمکو نظر گھر اپنا

قیدِ خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم — وحشت رہیگی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیرِ مغاں سے ہو کر تب سُرخرو ملینگے — فضل و ہنر کا ہوگا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ وش ہی گر وہ تو ہیں ہمارے ڈھب کا — ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی — کر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے — یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

غیروں کو لینگے آخر اپنا بنا کے کیا ہم

اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدّر اپنا

معنی کا تمنے حالی دریا اگر بہایا — یہ تو بتایئے حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے بانگِ طبلِ شاہی دن ہوگیا جب آخر — خوابِ گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کسکو ❊ اے عندلیبِ نالاں یہ تونے گل کھلایا
ویراں ہے باغ تسپر پھولی نہیں سماتی ❊ مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا
اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا ❊ گھر ہی بگاڑ ڈالا تونے بنا بنایا
ڈرتے رہینگے اب ہم بے جرم بھی سزا سے ❊ احسان اسکا جسنے ناحق ہمیں ستایا
واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہوگئے ہم ❊ کوئی جواب شافی پر اُس سے بن نہ آیا
آیا نہ تھا کبھی یہاں گویا قدم خزاں کا ❊ دو دن میں یوں پلٹ دی کسنے چمن کی کایا
تقلیدِ قوم ہی پر گر ہے مدارِ تحسیں ❊ تو ہمنے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی بچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہمکو اُن کا نشاں نہ پایا

نفس دعوی بے گناہی کا سدا کرتا رہا ❊ گرچہ اُترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا
حق نے احساں بیخ کی اور میں نے کفراں میں کمی ❊ وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی ❊ چپکے چپکے نفسِ خائن کا کہا کرتا رہا
طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہ خطا ❊ وار اُن کا اسلیئے اکثر خطا کرتا رہا
نفس ہیں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی ❊ اُسکو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا
سو نہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں ❊ اُنسے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
تھا نہ استحقاقِ تحسیں پر سُنی تحسیں سدا ❊ حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
شہرت اپنی جسقدر بڑھتی گئی آفاق میں ❊ کبرِ نفس اُتنا ہی یہاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

کہیں الہام منوانا پڑے گا ۱ کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا
ہو صوفی صفا کو تجھ میں لیکن ۲ کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا
نصیحت بے اثر ہی گر نہ ہو درد یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا
جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا اُنھیں سچّوں کو جھٹلانا پڑے گا
عوام الناس کا ہوگا جنھیں ہُو نہ اُنھیں خاصوں پہ ہو نہ آنا پڑے گا
رہی وصفِ جناں کی مشق واعظ تمھیں بچّوں کو پھسلانا پڑے گا
سخن میں پیروی کی گر سلف کی اُنھیں باتوں کو دُہرانا پڑے گا
تعلق کا ہے پھندا پیچ در پیچ قطعہ ۱ یہ عقدہ ہم کو سلجھانا پڑے گا
بہت یہاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے ۲ بس اب دُنیا کو ٹھکرانا پڑے گا
نہیں جو اُنس کی اس غمکدے میں ۳ کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا
دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے ۴ ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا
زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند ۵ وفا سے ہم کو پچتانا پڑے گا
جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید ۶ ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا

۳ {
بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اُسے دُنیا کا غم کھانا پڑے گا

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی
تمہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا

رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی
بس اب دل سے شکوؤں کو دھونا پڑیگا

بن آئے گی ہرگز نہ یھاں کچھ کیے بن
جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

کبتک اے ابرِ کرم ترسائے گا
مینہ بھی رحمت کا کبھی برسائیگا

پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں
جو لگائے گا تجھے پچتائے گا

دوست کا آیا ہی بھیجو اب پیام
آج اگر آیا نہیں کل آئے گا

ذوق سب جاتے رہی جز ذوقِ درد
اک یہ لپکا دیکھیے کب جائے گا

قطعہ
واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے ۱
پر مزا آنے کا یھاں کیا پائے گا

آئے گا اور ہمکو شرمائیگا مفت ۲
اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم ۳
ہم پہ موںہ آئے گا موںہ کی کھائے گا

دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف
رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

باغ و صحرا میں ہے جو تنگ دل
جی قفس میں اُسکا کیا لگ

قطعہ
رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا ۱
شعبدہ تازہ کوئی د

ابر و برق آئے ہیں دونو ساتھ ساتھ ۲
دیکھیے برسے گا

بس انجام ہے گویا
رہی اک نام ہے گویا
باقی ہی اک کام ہے گو

۱ برسنا۔ غصہ ظاہر کرنا ۱۲

مشکلوں کی جسکو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

وھاں اگر جائیں تو لیکر جائیں کیا
سو نہ اُس سے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں ہے باقی وہی حرصِ گناہ
پھر کئے سے اپنے ہم پچتائیں کیا

اَولیں اُسکو ہمیں جا کر منا
اُس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہو اُنس
ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعوے کرے
اک بزرگِ دین کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزلخوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل۔ ناصح!
اُس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اُسے دے آتے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مُٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اُس وقت سے سر پر ہے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیّار ہے وہ
اُس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دُنیا
ہمسے اَب جانکے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگر مے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لیکے ہٹایا جاتا

رحمت کا جہاں میں یونہیں اک نام ہے گویا
رحمت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یہاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دُنیا میں نکو نام ہے گویا

ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام ہیں اُن کا یہی انعام ہے گویا

ہے وقتِ رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی جیسے شام ہے گویا

اُٹھا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بُری طرح
آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا

ادبار بھی دیکھوگے جہاں پاؤگے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

جب دیکھیے حالی کو پڑا پایئے بیکار
کرنا اُسے باقی یہی اک کام ہے گویا

(ق)

خلوت میں تری صوفی گر نور صفا ہوتا — تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کمانداری — ہم بچکے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھکو خبر ہوتی — میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سُنا قاصد — اَن پڑھ تو ہے تو یہ کچھ پڑھتا تو بلا ہوتا

باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے الفت کی — گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا

ہم روزِ وداع اُس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت — رونا تھا بہت ہمکو روتے بھی تو کیا ہوتا

گر صاحبِ دل ہوتے سُن کر مری بیتابی — تمکو بھی قلق ہوتا اور مجھسے سوا ہوتا

جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھکو خبر ناصح — کچھ ہمسے سُنا ہوتا پھر تونے کہا ہوتا

جو جان سے درگذرے وہ چاہے سو کر گذرے — گر آج نہ تم آتے کیا جانیئے کیا ہوتا

کل حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سُننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سُنا ہوتا

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا — تھا حُسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا

ہمکو بہار میں بھی سرِ گلستاں نہ تھا — یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

ملتے ہی اُنکے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائیگا جی ایک نگاہ میں — تھی دل کی احتیاط مگر بیمِ جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے — تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

کچھ میری بیخودی سے تمہارا زیاں نہیں — تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

رات انکو بات بات پہ سو سو دیئے جواب — مجکو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یہاں — طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

جی کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی — مانا کہ اُسکے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار

شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

(ق) رنج اور رنج بھی تنہائی کا — وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا — کاٹنا ہے شب تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم — شوق تھا بادیہ پیمائی کا

اُس سے نادان ہی بن کر ملیے — کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ — حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

درمیاں پائے نظر ہے جبتک — ہمکو دعوے نہیں بینائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اُسکو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل — مجھکو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزم دشمن میں نہ جی سے اُترا — پوچھنا کیا تری زیبائی کا

یہی انجام تھا اے فصل خزاں — گل و بلبل کی شناسائی کا

مدد اے جذبۂ توفیق کہ یہاں — ہو چکا کام توانائی کا

محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

ق

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رلانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یہاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

دردا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصوروار اگر بے قصور تھا

دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال
ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا

روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا

بیمار کی تو آپ نے نہ لی تم نے کچھ خبر
پھر نمازِ نعش پہ آنا ضرور تھا

حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اسی کا کہ اتنا صبور تھا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا

دیکھی ہیں ایسی ان کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائے گا

مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ — ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی - مگر — دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے — پوچھینگے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں کہ ہمکو منایا نہ جائے گا
ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر — کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اسقدر — یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالیؔ پڑیں بس آپ
قصّہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا — دلاسا تمھارا بلا ہو گیا (ق)
دکھانا پڑیگا مجھے زخمِ دل — اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور — مرا شکر اُس کا گلا ہو گیا
وہ اُمّید کیا جس کی ہو انتہا — وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
ہوا رُکتے رُکتے دمِ آخر فنا — مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
نہیں بھولتا اُسکی رخصت کا وقت — وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد — ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
سمجھتے تھے جس غم کو ہم جانگزا — وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا
نہ دے میری اُمید مجھکو جواب — رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

سنگِ گراں ہے راہ میں تمکینِ یار کا — اب دیکھنا ہے زور دلِ بے قرار کا
اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
او مٹا بھی دو خلش آرزوئے قتل — کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو — ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا
سمجھو مجھے اگر تمہیں ہے آدمی کی قدر — میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا
گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال — سن لینگے وہ مآل شبِ انتظار کا
اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں — ہمکو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
ہر سمت گردِ ناقۂ لیلے بلند ہے — پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا
غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا — خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا

حالی بس اب یقیں ہو کہ دلّی کے ہو رہے
ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

ب

دردِ دل کو دوا سے کیا مطلب — کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
چشمۂ زندگی ہے ذکرِ جمیل — خضر و آبِ بقا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر — ظلِ بالِ ہما سے کیا مطلب

جو کریں گے بھریں گے خود واعظ — تم کو میری خطا سے کیا مطلب

جنکے معبود حور و غلماں ہیں — اُنکو زاہد خدا سے کیا مطلب

قطعہ

کام ہے مردمی سے انساں کی ۱ — زُہد یا اتقا سے کیا مطلب

ہے اگر رند دامن آلودہ ۲ — ہمکو چون و چرا سے کیا مطلب

صوفیِ شہر باصفا ہے اگر ۳ — ہو ہماری بلا سے کیا مطلب

نکہتِ مے پہ غش ہیں ۴ جو حالی

اُنکو دُرد و صفا سے کیا مطلب

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی مونہ میں زباں ہے اب ق

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا — چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

جس دل کو قیدِ ہستیِ دنیا سے تنگ تھا — وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب

آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات — اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب

اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا — ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز — ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب

ہے دل غمِ جہاں سے سبکدوش ان دنوں — سر پڑتا سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش

وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

پ

یہ ہیں واعظ سب پہ مُونہ آتے ہیں آپ   ناصحِ قوم اسپہ کہلاتے ہیں آپ
بس بہت طعن و ملامت کر چکے   کیوں زباں رندوں کی کھُلواتے ہیں آپ
ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو   چڑھکے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ
واعظو ہے اُن کو شرمانا گناہ   جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ
کرتے ہیں ایک اک کی تکفیر آپ کیوں؟ ۱   اِسپہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ
کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور ۲   خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ
چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد سے   بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

ت

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت   پر جوانی ہمکو یاد آئی بہت
زیرِ برقع تو نے کیا دکھلا دیا   جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت
ہٹ پہ اسکی اور پس جاتے ہیں دل   راس ہے کچھ اُس کو خود رائی بہت
سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں   دل پہ ہے نقش اُسکی رعنائی بہت
چُور تھا زخموں میں اور کہتا تھا حُرؒ   راحت اس تکلیف میں پائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا ۲   دوست یہاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے   مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

جاں نثاری پر وہ بول اُٹھے مری   ہیں فدائی کم تماشائی بہت

ہمنے ہر ادنےٰ کو اعلےٰ کر دیا   خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چُپ واقعاتِ دہر نے   تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی؟   یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت؟

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چُپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

اُسکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت   نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بُلبل   کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل   ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار   اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھیے شیخ مصور سے کھچے یا نہ کھچے   صورت۔ اور آپ سے بےعیب بشر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تمنے   یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص   اُسنے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر   آڑے آئی مرے۔ تسلیم سپر کی صورت

شوق میں اُسکے مزا۔ درد میں اُسکے لذت   ناصحو اُس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہے ضرور   رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا   راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی ہے بہت آج بھنور کی صورت

اُنکو حالی بھی بُلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپکے گھر کی صورت

بنلتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت

جسے دیکھکر دل ہو عاشق کا بےکل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت

شب وعدہ ہی بارِ عام اُنکے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

غمِ دل نے رسوا کیا ہمکو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت

ہی اس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخِ فانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جسکو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھکر قتل حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

(ٹ)

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

رچ رہی ہے کان میں یہاں لَے وہی
اور مغنّی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اَور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

اک کہانی پیرزن کی رہگئی
راج کسرے کا رہا باقی نہ پاٹ

دَیر سے مسجد میں ہم آتے تو ہیں
ہے مگر یہاں جی کچھ اے زاہد اُچاٹ

جو کہے تجھکو بنادیں اے امیر　　ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ
ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر　　سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ
برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر　　ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ
تیغ میں بُرّش یہ اے حالی نہیں　　جسقدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ
چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہی کون
شعر تو ظاھر میں ہیں تیرے سپاٹ

ث

باپ کا ہے جبھی پسر وارث　　ہو ہنر کا بھی اُسکے گر وارث ۲۲۴
گھر ہنرور کا ناخلف نے لیا　　تیرا ہے کون اے ہنر وارث
فاتحہ ہو کہاں سے میّت کی　　لیگئے ڈھو کے سیم و زر وارث
ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ　　کریں میراث سے حذر وارث
خاک و کرمانِ گور و خویش و تبار　　ایک میّت اور اسقدر وارث
واعظو دین کا خدا حافظ　　انبیا کے ہو تم اگر وارث
قوم بے پر ہے دین بے کس ہے　　گئے اسلام کے کدھر وارث
ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف　　جیسے مردہ کے مال پر وارث
ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میت پہ نوحہ گر وارث

بھید واعظ اپنا کُھلوایا عبث — دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث
جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی — رات بھر یاروں کو رِجھوایا عبث
شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز — سب کو مُلزم تو نے ٹھہرایا عبث
کوئی پنچھی آکے اب پھنستا نہیں — آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث
آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم — تو نے زاہد ہمکو شرمایا عبث
کھیتیاں جلکر ہوئیں یاروں کی خاک — ابر ہے گِھر کر ادھر آیا عبث
قوم کا حالی پنپنا ہے مُحال — تم نے رو رو سب کو رُلوایا عبث

ج

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج — بول کر ہم نے مُونہ کی کھائی آج
چُپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ — بات بگڑی بنی بنائی آج
شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی — پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
بزم ساقی نے دی اُلٹ ساری — خوب بھر بھر کے خُم لُنڈھائی آج
قطعہ
معصیت پر ہے دیر سے یارب ۱ — نفس اور شرع میں لڑائی آج
غالب آتا ہے نفسِ دوں یا شرع ۲ — دیکھنی ہے تری خدائی آج
چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو — نیند پھر رات بھر نہ آئی آج
گُل یہاں کاربار ہیں سب بند — کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

زَو سے الفت کی بچکے چلنا تھا
سُفت حالی نے چوٹ کھائی آج

تلخیِ دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج — یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج
رنج و شادی یہاں کے ہیں سب بے ثبات — اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج
تھا قناعت میں نہاں گنجِ فراغ — پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج
فکرِ سِن بڑھتے تھے شاید ساٹھ ستّھ — ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج
ہمکو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا — جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج
آگئی مرگِ طبیعی ہمکو یاد — شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج
راہ اب سیدھی ہے حالی سوئے دوست — ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

چ

بزمِ مے اچھی ہے۔ گو دُنیا ہے اے ہیچخواہ ہیچ
یہاں سمجھ لیتے تو ہیں دُنیا کو دم بھر یا ہیچ
نفس سے سر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل ہوش
ایک دشمن بر سرِ کیں ہو تو ہیں سب یا ہیچ
شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہی یہ سب اونچی دُکاں اور رونقِ بازار ہیچ

شاہدِ معنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
سبحہ و سجادہ ہیچ اور جُبّہ و دستار ہیچ

ہو گئے جتنے جسقدر اُتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو ہے یہ سب گفتارِ بے کردار ہیچ

رو لی تو آٹھ آٹھ آنسو اور پسیجا دل نہ ایک
نکلے موتی تیرے سب اے چشمِ گوہر بار ہیچ

خوانِ نعمت نے ترے اے عاملِ مُردار خوار
کر دیئے آفاق کے سب خوان و خواں سالار ہیچ

ہے ادب مسند پہ۔ جو کچھ ہے رئیسِ شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دوچار ہیچ

ح

کاٹیئے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

منزلِ دُنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح

سختی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اک کا یگانوں کی طرح

اُس کھیتی کے پنپنے کی اُنھیں ہو یا نہ ہو
ہیں اُسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح

اُنکے غصے میں ہے دلسوزی۔ ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

کام سے کام اپنے اُنکو۔ گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار

دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

کیجے کیا حالیؔ نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

خ

مئے مُغاں کا ہے چسکا اگر بُرا اے شیخ — تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ
ریا کو صدق سے ہی جامِ مے بدل دیتا — تمھیں بھی ہی کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر — تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ
غُرورِ فقر و غُرورِ غنا میں فرق ہے کیا — تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ
زباں پہ ہوتی ہی مُہر اُنکی جو ہیں محرمِ راز — پھر ایسا کیجیو ہرگز نہ ادّعا اے شیخ
قطعہ ۱ خبر بھی ہے تمھیں ہو کیا بن رہی ہی بیڑے پر — ہیں آپ جو لئے بیڑے کے ناخدا اے شیخ
۲ وہ ڈوبتوں سے الگ ہٹتے ہیں جو ہیں تیراک — شناوری کا یہی گُر ہے۔ مرحبا اے شیخ
گوزن و گور ہیں بچپن سے تارک دنیا — نہایت آپ کی ہے۔ اُنکی ابتدا اے شیخ
کمال حسنِ عقیدت سے آیا تھا حالیؔ — پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

د

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد — اب خوف کے سوا ہے دھڑکا رجا کے بعد
ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور — ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد
تعزیرِ جُرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہی اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اگر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا — آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اسکی یاد — آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم — ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر — تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر — بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد — تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد

درگذر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے — تو ترا اور کوئی ہوگا خدا اے زاہد

ہم دکھا دینگے کہ زہد اور ہے نیکی کچھ اور — کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد

قربِ حق کے لیئے کچھ سوزِ نہاں بھی ہو ضرور — خشک نفلوں میں دھرا کیا ہی بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تجھسے — تو ہی کہہ آہمیں ہے کیا میری خطا اے زاہد

جال جبتک ہی یہ پھیلا ہوا دینداری کا — فکرِ دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج کیئے تو نے بیاں — ذکر کچھ اور کر اب اسکے سوا اے زاہد

ذ

پیاس تیری بوی ساغر سے لذیذ — بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ

جسکا تو قاتل ہو پھر اسکے لیئے — کونسی نعمت ہی خنجر سے لذیذ

لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب
ہمکو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ

قند سے شیریں تری پہلی نگاہ
دوسری قندِ مکرّر سے لذیذ

بھانجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو
بھوک ہے وہ شیرِ مادر سے لذیذ

ہے یہ تجھمیں کس کی بوباس اے صبا
بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ

جو قناعت کے ہیں حالی میہماں
اُنکو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

ر

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر
وہی اصرار ہے خطاؤں پر

رہیں نا آشنا زمانہ سے
حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر

رہروو باخبر رہو کہ گماں
رہزنی کا ہے رہنماؤں پر

ہے وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا
مرتے ہیں ہم انھیں اداؤں پر

اُسکے کوچہ میں ہیں وہ بے پر و بال
اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر

شہسواروں پہ بند ہے جو راہ
وقف ہے یہاں برہنہ پاؤں پر

نہیں مُنعم کو اُسکی بوند نصیب
مینہ برستا ہے جو گداؤں پر

نہیں محدود بخششیں تیری
زاہدوں پر نہ پارساؤں پر

حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجے کس مُونہ سے اِن خطاؤں پر

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر

دوست اسکے ہیں نہ اُسکے آشنا
گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر

اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں
کرتے ہیں نفرت بدی سے جسقدر

کرنی پڑتی ہے کسیکی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسیکا عیب سُن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اُسے دل کھول کر

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اُس سے خواہاں عمر بھر

ایک رنجش میں بُھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہمپہ لاکھ احساں اگر

عیب کچھ گنتے نہیں اُس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بیخبر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ لاتے ہیں اُسکو سوئے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب اُن کا ظاھر اور اپنا ہنر

دوست اک عالم کے ہیں مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر یارو حذر

عیب حالی اپنے یوں کہتا ہے کون
خواہش تحسیں ہے حضرت کو مگر

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
دام اُٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر

گو ہو شفا سے پاس پہ جب تک ہے دم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کیے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر

آمادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی
سہروص کو رہے گا نہ عُریاں کیئے بغیر

عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آپڑی ہے ضد
چھوڑینگے نیمجاں کو نہ بے جاں کیئے بغیر

مشکل بہت ہی گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیئے بغیر

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیئے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت اُنھیں نہ مسلماں کیئے بغیر

حالی کٹیگا کاٹنے ہی سے یہ بیستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیئے بغیر

ڑ

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہوگئی ایک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آجتک قصرِ اَمَل ہے ناتمام
بنا چکی ہی بارہا کھل کھل کے پاڑ

ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھیلنا آتا ہے ہمکو بھی شکار
پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
سو شبستاں ہیں اگر روشن ہیں جھاڑ

عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اُجاڑ

کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سرسبز اور نیچی ہی باڑ

بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی
ان دنوں کترے ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تمنے حالی کھولکر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

ز

عہدِ وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز　　عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز

پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز　　جھونکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز

لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں　　ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

آیا نہ ہوگا اُسکو تغافل میں کچھ مزا　　ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز

ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا　　اُسنے نقاب رُخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز

یہاں دے چکی جواب امیدِ جوابِ خط　　وہاں نامہ برنے بار بھی پایا نہیں ہنوز

پایا ہے ذوق و شوق میں ہمکو بھرا ہوا　　کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز

کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد　　بھولے ہمیں کہ تجھکو بھلایا نہیں ہنوز

سرمایۂ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل　　باتوں میں ہمنے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اسقدر
حالی نے جام مونھ سے لگایا نہیں ہنوز

جیتے جی موت کے تم مونھ میں نہ جانا ہرگز　　دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی　　دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی　　زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں　　کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے　　تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رخنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یہاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یہاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یہاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جسکو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہمکو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا انپہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھکو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یہاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی　ہمکو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہو گی یارو　یاد کر کر کے اُسے جی نہ کُڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق　اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنوں کے بعد　شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو　ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں　نہ سُنیگا کوئی بُلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر　اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یہاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

رنجش و التفات و ناز و نیاز　ہمنے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اُس میں پاتا ہوں　دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز
شیخ! اللہ رے تیری عیّاری　کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
اک پتے کی جو ہمنے کہدی آج　رنگ واعظ کا کر گیا پرواز
ہمکو نسبت پہ فخر ہے تیری　تو گئی بھول ہم کو خاک حجاز
آج منکر بھی ناچ اُٹھیں گے　گر مغنّی کی ہے یہی آواز

قطعہ

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف　چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

یہ قطعہ اسوقت لکھا گیا تھا جبکہ ٹرکی کو سلطان عبد العزیز خاں کے قتل کے بعد سرویہ ۔ مانٹنگرو اور روس وغیرہ کے مقابلہ میں اخیر صدمہ پہنچا ۱۲

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا ۲ ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز

ہوتے جاتے ہیں زورمند ضعیف ۳ بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز

چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے ۴ گھونسلوں میں ہیں عقاب اور شہباز

ہے نہتوں کو رہگذر میں خطر ۵ رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز

ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم ۶ بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لب آز

ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے ۷ گھائلوں پر ہیں تیز تیر انداز

تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے ۸ حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز

دشمنوں کے ہیں دست خود جاسوس ۹ اور یاروں کے یار ہیں غماز

ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ ۱۰ ہے پر آشوب جبکہ یہ آغاز

لے ابھی تک کھلی نہیں لیکن ۱۱ غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر ۱۲ موج حائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے ۱۳ یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

کام اُسے اپنے سونپ دو حالی ۱۴ نہیں جس کا شریک اور انباز

ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے ۱۵ چارہ یہاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

س

جاذب رحمت ہے مقناطیس عصیاں اپنے پاس

رکھتے ہیں عاصی کمند صید غفراں اپنے پاس

عاجزوں سے مقتدر کرتے ہیں اکثر درگذر
عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس
ہو گئی گر کچھ سمجھنے میں خطا فرمان کے
عذرخواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس
بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند
رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ برہاں اپنے پاس
خاک میں ہمنے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس
دستبرد اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمداللہ وہ مُہرِ سلیماں اپنے پاس
دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویزِ استخلافِ رحماں اپنے پاس

چھیڑ اب نہ اے تصورِ مژگانِ یار بس
کافی ہے خارِ خارِ غمِ روزگار بس
یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے
غمخواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس
ہر داغ فصلِ گل کی نشانی ہے اے صبا
گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس
ڈر ہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں
اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس
واں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ
یہاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر کی نیند کیوں حرام ہیں اے انتظار بس

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

ش

اک عمر کو مہم برسر ایام ہے درپیش بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش

غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہی چار طرف سے اور معرکہ گردش ایام ہے درپیش

وہ دن گئے جب تھا مرضِ صعب کا آغاز اب اُس مرضِ صعب کا انجام ہی درپیش

گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہی درپیش

وہ وقت گیا۔ نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا اب وقتِ خمارِ مئے گلفام ہے درپیش

اُمیدِ شفا کا تو جواب آہی چکا ہے اب موت کا سُننا ہمیں پیغام ہے درپیش

جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

ص

ہر بشر سے اُسکی مختص ہیں عطائیں خاص خاص ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص

دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دنیا سے۔ مگر رہزنِ دل ہیں ابھی اُس کی ادائیں خاص خاص

گو زمانہ نے بھلا دی دل سے اپنے فصلِ گل یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص

زہد و تقویٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص

یوں تو ہے اُمید سب کچھ۔ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہمنے اے حالی خطائیں خاص خاص

درد۔ اور درد کی ہے سب کے دوا۔ ایک ہی شخص   یہاں ہے جلاّد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص
حور و غلماں کے لیئے لائیں دل آخر کس کا   ہونے دیتا نہیں یہاں عہدہ برآ ایک ہی شخص
قافلے گذریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ   ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص
قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں   فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص
جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے   آج ویسا کوئی دے ہمکو دکھا ایک ہی شخص
گھر میں برکت ہی۔ مگر فیض ہے جاری شب و روز   کچھ سہی شیخ۔ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

ض

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض   چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض
دل میں ہے اے خضر گر صدقِ طلب   راہرو کو رہنموں سے کیا غرض
حاجیو ہے ہمکو گھر والے سے کام   گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض
گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو   اُنکو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض
نیک کہنا نیک جس کو دیکھنا   ہمکو تفتیشِ دروں سے کیا غرض
دوست ہیں جب زخمِ دل سے بے خبر   اُنکو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض

عشق سے ہی مجتنب زاہد عبث | شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض
کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب | اب اُسے دُنیائے دوں سے کیا غرض

آئے ہو حالی پئے تسلیم یہاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

دوست کا نارو انہیں اعراض | دوستوں ہی کا کام ہے اغماض
چاہیئے ایک سب کا ہو مقصود | گو ہوں سب کی جدا جدا اغراض
یاد میں تیری سب کو بھول گئے | کھو دیئے ایک دُکھ نے سب امراض
دیکھیئے تو بھی خوش ہے یا ناخوش | اَور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض
لَا اُبَالِی بِاَنْ یُعَاتِبَنِی | کُلُّ نَاسٍ وَ اَنْتَ عَنِّی رَاضٍ
مُنعمو بذل خیر میں یہ دیر | اپنا مطلب اور اُس پہ سو اغماض
حق میں اپنوں کے سخت مُمسک ہیں | جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض
راہی ہے کچھ علیل سی تیری | نبض اپنی بھی دیکھ اے نبّاض
وعظ میں گُل کترتے ہیں واعظ | مونہہ میں اُن کے زباں ہے یا مقراض
ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع | هَلْ لَنَا فِی نِزَاعِنَا مِنْ قَاضٍ
ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد | خار کش تجھ سے ہے سوا مرتاض
شیخ کی تھی یہ آخری تلقیں | چاہیئے زر تو اُس سے کر اعراض
ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی | یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

ط

رات گذری ہو چکا دورِ نشاط — طے ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
دل سے خوشیاں ہوگئیں سب گوشہ گیر — نام تھا شاید جوانی کا نشاط
دن اب ایدل منقبض رہنے کے ہیں — ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط
غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں — فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط
زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ — جانیو واعظ اسے راہِ صراط
تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ — ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط
کوچ کی حالی کرو تیاریاں — ہے قُوے میں دمبدم اب انحطاط

ظ

چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ — بُرا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ
سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر — نہ ستار ہے تو نہ غفّار واعظ
نکل آئے گی مے کشی کی بھی حلت — کوئی مل گیا گر ہمیں یار واعظ
کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن — سُنا ہے کہ ہوتے ہیں عیار واعظ
ہمیں اَور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن — یہ جُبّہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ
نچھوڑے گا زیور گھروں میں نہ زر تو — یہی ہے اگر حسنِ گفتار واعظ
مسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے — ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

ع

اے بہارِ زندگانی الوداع — اے شباب اے شادمانی الوداع

اے بیاضِ صبحِ پیری السلام — اے شبِ قدرِ جوانی الوداع

السلام اے قاصدِ ملکِ بقا — الوداع اے عمرِ فانی الوداع

روزگارِ ضعف و سستی الصلا — وقتِ سعی و جانفشانی الوداع

قطعہ

فرصتِ عشق و جوانی الفراق ۱ — دورِ عیش و کامرانی الوداع

تجھکو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں ۲ — اے نعیمِ جاودانی الوداع

تیرے جاتے ہی گئیں سب خوبیاں ۳ — اے خدا کی مہربانی الوداع

آلگا حالی کنارے پر جہاز — الوداع اے زندگانی الوداع

غ

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ — دیکھ اس خرام ناز پہ اتنا نہ کر دماغ

ہے تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں — حملے سے یہاں اجل کے نہیں ایکدم فراغ

یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو — بلبل بہت ہی دیکھکے پھولوں کو باغ باغ

دو چار گام نقشِ قدم مل کے رہ گئے — آگے چلا نہ آہوئے مشکیں کا کچھ سراغ

آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہلِ ظرف ہوں — ساقی بھرے دھرا ہے مئے لعل سے ایاغ

جنگل میں تختۂ گل خودرو کو دیکھکر — تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزمِ شعر میں — باری تب انکی آئی کہ گل ہوگئے چراغ

ف

حق نہ مُلّا نے کچھ بتایا صاف — اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف
آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کُھلی — مہر روشن نظر نہ آیا صاف
کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم — صاف تھے آپ سبکو پایا صاف
زاہدو ہم تو تھے ہی آلودہ — تمکو بھی ہمنے کچھ نہ پایا صاف
کیوں فقیہوں سے رُک گئے حالی — بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

ق

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لایق — نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لایق
کرے گا کیا تیرا کحل الجواہر اے کحّال — نہیں یہ آنکھ ہی دیدار یار کے لایق
مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ — بہت ہے زندگی مُستعار کے لایق
غرور و حرص ہیں زیور عروسِ دُنیا کے — بناؤ تھے یہی اِس نابکار کے لایق
کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز — رہا نہ باغ قدوم بہار کے لایق
بس اب ہے فضلۂ روباہ و گرگ پر گذران — رہا نہ شیر ژیاں خود شکار کے لایق
گنہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے — ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لایق
گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی — تمھیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لایق
یہ ہمنے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ — مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لایق

ک

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک　　تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں　　جہاں ہو راہزنِ خلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر　　بنا ہے غوثِ زماں آجکل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں　　مری نگاہ میں ہو رند و پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے امید ہو اُسوقت　　کہ یار یار سے ہو جائیگا جدا ایک ایک

چھپا کے اُس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے　　جب آپ مونہ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اُسکی بندگی کا ادا　　کیا ہے جسنے حق خواجگی ادا ایک ایک

اسیرِ حاج کی ہمت میں گر نہ آئے قصور　　تو موج بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو　　ورق جب اُسکا اڑالیگئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ　　جگر کے پار ہو اب بھی تری نوا ایک ایک

وہ عشق ہو نہ جوانی وہ تو ہو اب نہ وہ ہم　　یہ دل پہ نقش ہو ابتک تری ادا ایک ایک

نہ ہم رہینگے نہ حالی یہ دلخراش جہاں　　رہیگی حالیِ دلگیر کی صدا ایک ایک

گ

عالمِ آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ　　ہے زمیں اُنکی اور اُنکا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلایشوں میں ۔ بنا شوئیں بے لگاؤ　　رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو — ہے عشیرہ اور انکا دودماں سب سے الگ
سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں — ہے کوئی بھیدی اور اُنکا رازداں سب سے الگ
جا پہنچتے اور وں کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں — رکھتے ہیں اپنا طریقِ امتحاں سب سے الگ
اک چمن بہرِ تفرّج رکھتے ہیں زیرِ بغل — روضۂ و بُستان و فردوسِ جناں سب سے الگ
کلبۂ احزاں ہے روشن اُن کا جس مہتاب سے — ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندوں میں یہاں جکڑا ہوا ہے بند بند — پر ٹٹولے کوئی دل اُنکا تو وہاں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے — دردمندوں کا ہے دُکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دُکاں سب سے الگ

صلح ہے اک مُہلتِ سامانِ جنگ — کرتے ہیں بھرنے کو یہاں خالی تفنگ
عہدِ گیتی پر نہ پھُولیں کامراں — آخر اسکی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا۔ اخلاق کیا۔ ہتھیار کیا — سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
روکیے بدخو کو بدخوئی سے کیوں — آپ اپنی خو سے آجائے گا تنگ
زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ — یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ
پاکبازوں کو نہیں کچھ قیدِ وضع — جو ہیں اچھے اُنپہ سب کھلتے ہیں رنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا — دل میں اب اُٹھتی نہیں کوئی اُمنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل — دیکھ پہلے جن کو رہجاتے تھے دنگ

کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح | اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ
عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ | ہو ابھی کم حاصلِ افیون و بنگ
بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت | ہو گی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ
قوم کو حالیؔ نہیں راس اتفاق | پھوٹ ہی کا بس کھلیگا ہم پہ رنگ

ل

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل | یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل
رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ سلف | اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل
اک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں | ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل
کب تک آخر ٹھیر سکتا ہے وہ گھر | آ گیا بنیاد میں جس کی خلل
ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار | تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ امل
اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی | لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل
دیکھئے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع | ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل
کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں | وقت کوشش کا گیا شاید نکل
اب سنو حالیؔ کے نوحے عمر بھر | ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

م

مدرسہ میں دہر کے رو بر قفا بیٹھے تھے ہم | اُٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم

پھروہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ　زالِ دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم
صحبتیں اہلِ ورع کی سب گئیں نظروں سے گر　بزمِ رنداں میں یونہیں اک ورجا بیٹھے تھے ہم
شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی　ورنہ دھوکا۔ دور سے دیکھ اُسکو کھا بیٹھے تھے ہم
ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تری　آدمی تجھکو سمجھکر پاس آ بیٹھے تھے ہم
سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر　ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اُٹھا بیٹھے تھے ہم

ہمسے خود دنیا ہی پٹتی ہائی نہ حالیؔ ورنہ یہاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم　پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم
خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں　گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمایش کے نہیں　پر گنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم
دیدہ و دل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز　گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم
دل میں مردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر　پر اُسے آلودہ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم
ہوکے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں وہی　جرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم
ہیں فدا اُن دوستوں پر جنمیں ہو صدق و صفا　پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم
گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا　اک جہاں سے آپکو لیکن خفا پاتے ہیں ہم
جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا　اپنے میں گر شمۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم
بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا　گر کبھی توفیقِ ایثار و عطا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر　　درد خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھیرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے　　حال نفس دوں کا اُتنا ہی بُرا پاتے ہیں ہم

جسقدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے　　کبر و ناز اُتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم

گو بھلائی کر کے ہمجنسوں سے خوش ہوتا ہے جی　　تہ نشیں اُس میں مگر دُردِ ریا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر　　داغ رسوائی کے کچھ زیر ردا پاتے ہیں ہم

راہ کے طالب ہیں پر بیراہ پڑتے ہیں قدم　　دیکھئے کیا ڈھونڈھتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہننے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں میں نیا پاتے ہیں ہم

ق آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم　　سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم　　کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگیٔ شب کا مزا بھولتا نہیں　　آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشک عدو تک گراں نہیں　　تنگ آگئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر یہ زخم تیغ عشق　　بدلینگے تجھکو زندگیٔ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر　　آئے ہیں آج چھوٹ کے قید گراں سے ہم

ہنستے ہیں اُس کے گریۂ بے اختیار پر　　بھولے ہیں بات کہکے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو　　کچھ پا گئے ہیں آپکی طرز بیاں سے ہم

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں　　ملتے ہیں جا کے دیکھئے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھینگے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

ن

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

یاد اُسکی دل سے دھو دے اے چشمِ تر تو مانوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دونو بُری ہیں تیری
جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں

کہتے ہیں جسکو جنّت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ اِن دلوں تو ہمپر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یہاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہمپر ہنستے ہیں چار ہمپر
یہاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جنکے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی اُنکی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آتی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

روونے میں تیرے حالی لذت ہی کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

جب سے سُنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اک آن ہمیں
اب نہ سُنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوتے کان ہمیں

کچھ روزوں غفلت میں پھرے یہاں ڈھونڈتے ہم آسایش کو
کُھل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں

چل کے نئی اک چال فلک نے کھو دیئے ہوش حریفوں کے
زَد سے بچیں یا مات قبولیں اتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس اُنھیں گر اپنا ذرا ہو جاں اپنی بھی اُنپہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسیکا پاس نہو
تبلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اُسکو سارے تمھارے آگئے یاد احسان ہمیں

یہاں تو بدولت زہد و ورَع کے نبھ گئی خاصی عزت سے
بن نہ پڑا پر کل کے لیئے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سُر تھے وہی اور تال وہی پر راگنی کچھ بیوقت سی تھی

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر ارماں ہمیں

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں

بس کوئی دن کا اب حالی یہاں سمجھو تم مہماں ہیں

کی تو ہیں ہمنے بھی حالی کوچ کی تیاریاں   سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

خواب راحت میں وہ لذت تیرے ای پیری نہیں   جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں

ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار   ناگوار اُنسے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی   سب کو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریاں

زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال   اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہیں ہشیاریاں

بے مزہ ہی اہلِ دیں کی ترشروئی بھی مگر   اُس سے پھیکی اہلِ دنیا کی ہیں ظاہرداریاں

گو طبیعت سے گئے سب مادّے فاسد نکل

کم ہوئیں حالی نہ لیکن نفس کی بیماریاں

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں   آج ہم شہر میں خون اپنا ھدر کرتے ہیں

عقل کی بات کوئی ہمنے کہی ہے شاید   جنّتی جتنے ہیں سب ہمسے حذر کرتے ہیں

جُرم خالق سے سوا پاتے ہیں جُرمِ فقہا   جب کہ ہم اپنے جرائم پہ نظر کرتے ہیں

کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ!   بول قوّال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں

زہد و طاعت کا سہارا نہیں جبسے زاہد   یادِ اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں

عیب یہ ہے کہ کرو عیب۔ ہنر دکھلاؤ   ورنہ یہاں عیب تو سب فردِ بشر کرتے ہیں

غمزدہ رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دکھاتے ہیں وہی جن میں کہ گھر کرتے ہیں

جی رکاوٹ سے جو اُن کی کبھی رک جاتا ہے
اک لگاوٹ ہیں ادھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں

ایک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں

تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ مہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں

قیصر و زار کا یہاں پیٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی گذر کرتے ہیں

کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلینگے سیکڑوں اسمیں

کی نصیحت بُری طرح ناصح
اور اک بس ملا دیا بس میں

ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشم انسان و چشم نرگس میں

بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں

دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اُسمیں اور اِسمیں

ہو نہ قبضے میں جب عنانِ فرس
ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں

جس سے نفرت ہے اہل نعمت کو
وہی نعمت ہے چشم مفلس میں

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

جانور۔ آدمی۔ فرشتہ۔ خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

آج کل چرخ صلح جو ہے بہت
دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اُسکو مجلس میں

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں — ہیں مئے ناب کے دلاّل۔ قدح خوار نہیں
شہر میں اُنکے نہیں جنسِ وفا کی بکری — بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں
کونسے وہ گلِ رعنا پہ نوا سنج نہیں — کونسی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں
کبھی لیلی پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا — اور جو پھر دیکھو تو دونو سے سروکار نہیں
اُٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی اُنسے — دل پھنساکر کہیں بنتے وہ گنہگار نہیں
عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ — اور جو ہو کھیل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں
نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا اُن کو — دربدر جھانکتے پھرنے سے اُنھیں عار نہیں
بوالہوس کام طلب بندۂ نفس اہلِ ہوا — ایک عالم ہے اِسی رنگ میں دوچار نہیں
دعوئ عشق و محبت پہ نہ جانا اُنکے — اُن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشق صادق ہوں میں
کہدو واللہ کہ صادق نہیں۔ زنہار نہیں

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آکے پھر چمن میں — اک حشر سا ہے برپا مُرغانِ نغمہ زن میں
بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے — بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں
بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا — پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں
چپ ہے زبان سوسن حیراں ہے چشم نرگس — قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

ہیں اور تو اد آئیں ساری سہی قدوں کی
پٹّی ہے جان باقی بس سرو و ناروں میں

ہے عیدِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہاراں
جنگل بسا ہوا ہے سب عطرِ یاسمن میں

مونہ سے دُھواں سا اُٹھّا لیتے ہی نامِ اسلام
بارود بجھ رہی تھی گویا لب و دہن میں

پھر زخم پھوٹ نکلا۔ حالی نہ چھیڑنا تھا
فصلِ خزاں کا قصّہ ذکرِ گل و سمن میں

گو رو چکے ہیں دُکھڑا۔ سو بار قوم کا ہم
پر تازگی وہی ہے اِس قصّۂ کہن میں

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سُنا بھی؟ اُس پر کیا گذری انجمن میں

پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا
روندن میں ہے وہ گلبن پھُولا تھا جو چمن میں

رُوبہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملّت
تھی سہمناک کل تک جو شیر کے بَرَن میں

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستندِ یمن[8] کی
ہے اب بجائے حکمت خاک اُڑ رہی یمن میں

وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے
ہے کال موتیوں کا اب سر بسر عدن میں

قبرِ اُویس پر ہے بس فخر اب قرن کو
زندہ اُویس کوئی باقی نہیں قرن میں

اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اُڑا دی
فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں

ڈالی نہ ہوگی آگے اے دورِ چرخ شاید
جو ایک تو نے ہلچل ڈالی ہے انجمن میں

فوج اور سپہ دونو پھرتی ہیں بے سری سی
گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رن میں

خُرد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا
لُٹنے کی قافلے کے پہنچی خبر وطن میں

8 یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ الایمان یمانٍ والحکمۃ یمانیۃٌ یعنی ایمان ہے تو یمن کا ہے اور حکمت ہے تو یمن کی ہے" اسی بنا پر میر باقر داماد نے اپنے فلسفہ کا نام حکمتِ یمانیہ رکھا ہے ۱۲

بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب   جائیں کدھر کہ ہر سو دَوں لگ رہی ہی بن میں
حالی بس اب نہیں یہاں سُننے کی تاب باقی   مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہی یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

ہی جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب ٹھیرتی ہی دیکھیے جاکر نظر کہاں
ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور   ہوتی ہی آج دیکھیے ہمکو سحر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر   تھا اُسکو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق   رکھی ہی آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا   خط کا مرے جواب ہی اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہی دلِ وحشی کنارہ گیر   اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہی گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور   عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی   دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

پیا ہے ہمنے نہ جامِ بے کدورت بزمِ دوراں میں   خزاں کو لیگئے ہمراہ اگر پہنچے گلستاں میں
نہیں کچھ منحصر دلبستگی زلفِ پریشاں میں   جو دل چاہے تو اُلجھے اک غبارِ دودِ پیچاں میں
اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشقِ زلیخا نے   نہ رہنے دیگا حُسنِ خودنما یوسف کو کنعاں میں

تصور نے بھلایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو — نہ کچھ کلفت ہی زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر — کہاں تک جی نہ گھبرائے اکیلی دردِ ہجراں میں

زباں تقریر سے قاصر قلم تحریر سے عاجز — نہ پوچھو ہمسے کیا دیکھا ہے ہمنے بزمِ رنداں میں

فلک سے جیتے جی معلوم ملنا کامِ دل اے خضر — سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہے آبِ حیواں میں

نہ چھوڑیگی محبت یار سے ناکام عاشق کو — نسیمِ مصر کو آنا ہے اک دن بیت احزاں میں

گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹ جاتا ہے — ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں

بہت دن چاہییں یوسف کو تا پہنچے زلیخا تک — نکلکر چاہِ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زنداں میں

نہ دی حیرت نے حالی فرصتِ سیرِ جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں (ق)

مجھکو تمسے ہے اعتمادِ وفا — تمکو مجھسے پر التفات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ — زندگی موت ہے حیات نہیں

یوں نہیں گذرے تو سہل ہے لیکن — فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں

کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں

ذرہ ذرہ ہے مظہرِ خورشید — جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

ہنسنے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار
بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا
فتنۂ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں

محتسب! صدق و صفا یہاں ہیں انھیں کے دم تک
مصلحت برہمیٔ صحبتِ رنداں میں نہیں

یہاں بھی ہے کون مکاں سے دلِ وحشی آزاد
جسکو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل یوں ہی ٹھیر جائے گا
بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

کس طرح اسکی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

آدمی ہو تو کبھی پاسِ محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالیِ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں
شادیِ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں

خوبروئی کے لیئے زشتیِ خو بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھسا طرحدار نہیں

قول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار
ہمکو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

کل خرابات میں اک گوشہ سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

حق ہوا کس سے ادا اُس کی وفاداری کا جسکے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں

دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کونسی راہ کعبہ و دَیر سے کچھ ہمکو سروکار نہیں

ہوں گے قائل وہ ابھی مطلعِ ثانی سُنکر

جو تجلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

ہیں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

چشم بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کے ساتھ غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں

ہو چکا ناز اُٹھانے میں ہے گو کام تمام للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں

مدتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں

اصلِ مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا ورنہ ہم اور کسی شئے کے طلبگار نہیں

بات جو دل میں چھپاتے نہیں بنتی حالی

سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

وحشت میں تھا خیالِ گل و یاسمن کہاں لائی ہے بوئے اُنس نسیمِ چمن کہاں

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی جائے گا دَیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

اہلِ طریق جسکو سمجھتے ہیں زادِ راہ وھاں وخل دستبرد کو اے راہزن کہاں

فصلِ خزاں کمیں میں ہو صیاد گھات میں مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرفِ آشنا لیجائے ہمکو دیکھئے ذوقِ سخن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں مگر　　وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
دل ہو گیا ہے لذّتِ غربت سے آشنا　　اب ہم کہاں ہو لتے نشاطِ وطن کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی ہیں دشمن آپ کے　　شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

روکا بہت کل آپ کو حالیؔ نے وھاں مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں

ق

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح　　لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں　　دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
کہیں انجام آپہنچا وفا کا　　گھُلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا　　بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا　　اگر فرصت ملی مجھکو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے ملکر　　ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

و

ق

مرے دل میں ہو۔ گو مجھ سے نہاں ہو　　مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو
نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عدو کا　　اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو
تقاضائے محبت ہے۔ وگرنہ　　مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بیقدر ہوں محفل میں تیری　　کہیں ناخواندہ تو بھی میہماں ہو
مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں　　بہت کیوں آج مجھپر مہرباں ہو
کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے　　جسے سُننی ہماری داستاں ہو

مؤثر ہے بہت **حالی** ترا وعظ
کل اُس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

حکم ہے پیرِ مُغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ　　خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ
دل کو کس طرح سمجھیے کہ وہی ہے یہ دل　　وہ اُمیدیں ہیں نہ ارماں وہ اُمنگیں ہیں نہ چاؤ
یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر　　تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ
دوست ہوں جسکے ہزاروں وہ کسیکا نہیں دوست　　سچ بتا تجھکو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ
تو وہی برقِ جہاں سوز رہے بن خواہ نہ بن　　ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ
ایک ہی دوست اور اُس سے ہمیں چھڑواتے ہو　　ناصحو اب تمھیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ
ہو گیا ذکر قیامت تو اب اے حضرتِ وعظ　　باتیں کچھ اور کرو قصہ کوئی اور سناؤ
تجھکو اے ابر بلا دیکھکے جی چھوٹ گیا　　ایک ہی بار تم اے بادلو اسطرح نہ چھاؤ
پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا　　ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ
دیکھیں کسطرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ اُمید　　آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مِلکے بہاؤ
اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک　　آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ　　وقت اب ہاتھ سے جاتا ہی جو آتے ہو تو آؤ

اُسکے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف — ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

ھ

درِ فیضِ حق بند جب تھا نہ اب کچھ — فقیروں کی جھولی میں ہو اب بھی سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یہاں بھیک زاہد — بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
کچھ اور آؤ بن کر تم اے میرو مرزا — نہیں پوچھتے یہاں حسب اور نسب کچھ
یہ طبلِ تہی ہیں جو ہنکارتے ہیں — جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ
دیا تو نے یہاں جس بہانے سے چاہا — ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ
ہے افسردہ مجلس کی خِسّت سے واعظ — وہ گرمائیگا یہ پسیجینگے جب کچھ
تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب — نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ
یہ ہے میرِ مجلس کہ چپ ہی کی موت — ٹٹولو تو ہیچ اور جو دیکھو تو سب کچھ

کوئی لقمہ چرب تاکا ہے شاید
یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلّف علامت ہے بیگانگی کی — نہ ڈالو تکلّف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت — جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے — نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ
کرو علم سے اکتسابِ شرافت — نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو　　اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے　　نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا ایک اک سے احوال کہنا　　مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا　　مبادا کہ ثابت ہو خست زیادہ
پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت　　بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ
کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن　　جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا　　نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا　　جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے　　خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم　　پہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا　　مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت یہاں ہم زمانہ کے ہاتھوں　　پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر　　نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دُھرپت زیادہ

(ق) حقیقت محرم اسرار سے پوچھ　　مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ
وفا اغیار کی اغیار سے سن　　مری الفت در و دیوار سے پوچھ

ہماری آہِ بے تاثیر کا حال — کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ

دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری — کمندِ گیسوئے خمدار سے پوچھ

دلِ مہجور سے سُن لذتِ وصل — نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ

نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق — ہماری چشمِ دریابار سے پوچھ

نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست — کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ

فریبِ وعدۂ دلدار کی قدر — شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ

فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل — یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ

تصوّر میں کیا کرتے ہیں جو ہم — وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ

متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالی — مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ی

ہے اُنکی دوستی پر ہمکو تو بدگمانی — وہ ہمکو دوست سمجھیں یہ اُنکی مہربانی

بے جُرم کوئی آخر کب تک سُنے ملامت — ناصح سے ہمکو اپنی کہنی پڑی کہانی

عاشق کے دلکو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے — دیتا نہیں وہ لذّت پیاسے کو سرد پانی

امیدِ وصل سے ہے کچھ جی ٹھہرائے دیتا — جو کچھ سُنا ہے ہمنے مشاطہ کی زبانی

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں ہوں خوش — کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی

صبر و سکوں سے ہمکو یہ بھی نہ بیٹھنے دے — تھوڑی سی رہ گئی ہے لے کاہشِ نہانی

پھر یہ بنا ہے ہستی ہے تیرے بعد ویراں
ہی تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی

دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور نہ دل نے
کیا جانئے کس ادا سے کی اُس نے دلستانی

اک نکتہ کے بیاں سے سر بر نہ ہو گے حالی
چلتا نہیں کسیکا یہاں لافِ نکتہ رانی

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے

جو کچھ ہے سو ہے اُسکے تغافل کی شکایت
قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے

دلّالہ نے امید دلائی تو ہے لیکن
دیتے نہیں کچھ دل کو تسلّی یہ دلاسے

ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہِ خوباں
یہاں ہیں۔ تو فقط تیری محبت کے ہیں پیاسے

پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں
ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں ترآبِ بقا سے

در گذرے دوا سے تو بھروسہ پہ دعا کے
در گذریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خدا سے

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو
تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دعا سے

حالی دلِ انساں میں ہے گم دولتِ کونین
شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے

جب وقت پڑے دیجئے دستک درِ دل پر
جُھکئے فقرا سے نہ جھکئے اُمرا سے

اک بک دو قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کسکا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کسکا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مَرو کسکا ہے بدخشان و ختن کسکا ہے

دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیت حزن کسکا ہے

مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخ کہن کسکا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہی یا ذات خدا
ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کسکا ہے

آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق
عزم تسخیر پھر اے شیخ زمن کسکا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہل نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کسکا ہے

عشق ادھر عقل ادھر دھن میں چلے ہیں ہی
رستہ اب دیکھیے دونوں میں کٹھن کسکا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھمیں یہ اے مرغ چمن کسکا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سپاہ و مہر سپہ باغ باغ ہیں لیکن
بھیر روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرنے آئے ہیں احباب
کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے

قلق انھیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیئے خلجان بینوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بار امانت سے تیرے سب عاجز
زمیں بھی اپنے خزانے اگلتی جاتی ہے

اڑے گی خاک تقدس کی اب سر بازار
فقیہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

بُری اور بھلی سب گذر جائیگی — یہ کشتی یونہیں پار اُتر جائے گی
ملیگا نہ گلچیں کو گُل کا پتا — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملّاح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر — یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ! — یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں اُمیدیں نہ ہوں — یونہیں عمر ساری گذر جائے گی

سُنینگے نہ حالیؔ کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی — کہ اُنکے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن — حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گُل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گلچینی ہی یا لُٹّس ہے گلچیں یا ہے قزاقی
کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے — یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی
رہی دانائی آخر غالب آکر پہلوانی پر — گئے جیں مان سب چینی و فرغانی و قبچاقی
ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ — لُنڈھائے خم پہ خم غیروں پہ کیوں مسکٹ ہو گرساقی

مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالیؔ
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز — اسمیں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی — اسمیں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے — گھات میں اُن کی لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی

دوست گر بھائی نہو دوست ہے تو بھی لیکن — بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی

اے غمِ دوست تجھی پر نہیں اپنی گذراں — کچھ فتوح[8] اسکے سوا اور ہے بالائی بھی

دل غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دنیا جو لوگ — تیور اُن کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

عقل ہے۔ اپنی حماقت کے چھپانے کی اُنھیں — جنھیں کچھ ساتھ حماقت کے ہی خودرائی بھی

عقل اور حُسن پہ جنکے بھری مجلس ہو گواہ — اُنکو خودرائی بھی پھبتی ہی خودآرائی بھی

ملنے دے گی نہ اجل تمسے ہمیں جی بھر کر — فرصت اے دوستو دنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم۔ پہ رہے مُردوں[؎] سے بدتر حالی

دیکھ لی ہمنے طبیبوں کی مسیحائی بھی

رہا کھٹکے زاہد کا زُھدِ ریائی — بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

بُرائی ہو رندوں میں بھی شیخ! لیکن — کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی

گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب — عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی

رُکا ہاتھ جب۔ بنگئے پارسا تم — نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے — سوا اسکے مُنعم میں ہی کیا بڑائی

8 یعنی غمِ دنیا و غمِ زن و فرزند وغیرہ ۱۲ ؎ اپنے دائم المرض ہونے کی طرف اشارہ ہے ۱۲

جو کہیئے تو جھوٹی جو سُنیئے تو سچّی — خوشامد بھی ہمنے عجب چیز پائی
ہوئی آکے پیری میں قدرِ جوانی — سمجھ ہمکو آئی پہ ناوقت آئی
وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت — وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی
جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح — جو وہاں دل پہ لی تھی تو یہاں مونہ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو **حالی**
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

وصل کا اُسکے دلِ زار تمنائی ہے — نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
قطعِ اُمّید نے دل کر دیئے یکسو۔ صد شکر — شکل مُدّت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے
قوّتِ دستِ خدائی ہے شکیبائی میں — وقت جب آکے پڑا ہے یہی کام آئی ہے
ڈر نہیں غیر کا۔ جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے — ہمنے جب کھائی ہے اپنے ہی سے کھائی ہے
نشہ میں چُور نہ ہوں جھانجھ میں مخمور نہ ہوں — پند یہ پیرِ خرابات نے فرمائی ہے
نظر آتی نہیں اب دل میں تمنا کوئی — بعد مدت کے تمنا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی۔ اور انگلیاں اُٹھیں سب کی
سچ میں **حالی** کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

اُتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے — جسقدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دوچار — آئے اِس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے
دیکھ اے بُلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھولکر — پھُول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی — لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق — آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
تجھ میں جوت اے شمع ہے کس برقِ عالم سوز کی — جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

تم میں وہ سوز نہ ہم میں ہے وہ ایماں باقی — رہ گیا کھیل ہے اب اے گبر و مسلماں باقی
بزمِ دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اُسوقت — میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی
حق ادا اک نگہِ لطف کا ہوگا کیونکر — دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی
ظاہرا دردہی الفت کا نہیں چارہ پذیر — ورنہ چھوڑا انہیں ہمنے کوئی درماں باقی

توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجیے — نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے
وہاں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہی بار — اُس سے آخر کسطرح پیدا تعارف کیجیے
ضبط کیجیے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں — اور کھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجیے
دوست کے تیور ہیں ہم ہر رنگ میں پہچانتے — بے تکلف ملیئے ہمسے یا تکلف کیجیے
جب کہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہے پھر سہل الوصول — شیخ لگتے ہاتھ اسپر بھی تصرف کیجیے
وقت تھا جو کام کا حالی گنوا بیٹھے اُسے — چاہیئے اب عمر بھر بیٹھے تاسف کیجیے

تو یہ حضرت کی یونہیں اک دودھ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دینگے ذرا دم بھر توقّف کیجئے

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی — جان کو ہمنے لگا لی ہے یہ عِلّت کیسی
جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیمِ خزاں — جنکی قسمت میں ہو کلفت انھیں راحت کیسی
جی کا اُلفت کو سمجھتے تھے ہم اک بہلاوا — وہ تو آفت تھی ہمارے لیئے۔ الفت کیسی
جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع ناداں — قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی
عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ — جنکو کچھ کام نہیں یہاں۔ انھیں فرصت کیسی
جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا — وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی
جانتا ہے وہی۔ دل پر ہے گذرتی جسکے — ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیسی
ہمنے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک — ہمسے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی
جبکہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح — وہ بھی کام نہیں کرتی۔ نصیحت کیسی

نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی انجام
یار کی یہ بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

سعی سے بہتر تن آسانی مری — کفر سے بد تر مسلمانی مری
تھا نہ محتاجِ سببِ عفوِ کریم — کچھ نہ کام آئی پشیمانی مری
خلد میں بھی گر رہی یاد اُسکی زُلف — کم نہ ہو شاید پریشانی مری
ہے لباسِ جسم تک مجھپر گراں — دور جا پہنچی ہے عُریانی مری

باغِ گلگشت ہے بے بیمِ خزاں — موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدرِ نعمت ہی بقدرِ انتظار — حشر پہ ٹھہری ہی مہمانی مری

خندہ زن ہے اُس مُسلمانی پہ کفر
جیسی ہے حالی مسلمانی مری

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے — شکوے وہ سب سُنا کیئے اور مہرباں رہے
کیا کیا ہیں دل میں دیکھئے ارماں بھرے ہوئے — ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید — اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی — اُتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا — اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے — نرخِ متاعِ عشق۔ الٰہی گراں رہے

حالی سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اُنہیں کہاں رہے

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اُس کی کاٹتے رہے اور ہمزباں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ — یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مُغاں رہے
وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس — ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیم جاں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ — تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل ہی میں ہمارے نہاں رہے

(ق)

حقِ وفا کے جو ہم جتانے لگے　　آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے
تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو　　عذر اُن کی زباں پہ آنے لگے
ہمکو جینا پڑے گا فرقت میں　　وہ اگر ہمت آزمانے لگے
ڈر ہے میری زباں نہ کُھل جائے　　اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی　　غیر الفت بہت جتانے لگے
تمکو کرنا پڑے گا عذرِ جفا　　ہم اگر دردِ دل سنانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم　　ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں　　قافلے پھر حرم کو جانے لگے
سرِ باطن کو فاش کر یارب　　اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

(ق)

حشر تک یہاں دلِ شکیبا چاہیئے　　کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیئے
ہے تجلّی بھی نقابِ روئے یار　　اُسکو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیئے

غیر ممکن ہے نہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اُسکو لکھا چاہیئے

ہے دلِ افگاروں کی دلداری ضرور
گر نہیں اُلفت مُدارا چاہیئے

ہے کچھ اک باقی خلش اُمید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیئے

دوستوں کی بھی نہو پروا جسے
بے نیازی اُسکی دیکھا چاہیئے

بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کیجیے اغماض جتنا چاہیئے

شیخ ! ہے اِن کی نگہ جادو بھری
صحبتِ رنداں سے بچنا چاہیئے

لگ گئی چُپ حالیِ رنجور کو
حال اُس کا کس سے پوچھا چاہیئے

جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے
قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

دمِ گریہ کس کا تصور ہے دل میں
کہ اشک اشک دریا ہوا چاہتا ہے

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُنکے
ملاپ اُنسے گویا ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہمکو
وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے

ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے

مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت
کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

فزوں تر ہے کچھ اِن دنوں ذوقِ عصیاں
درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی
کوئی دن میں رسوا ہوا چاہتا ہے

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک؟
دل اپنا بھی تجھسا ہوا چاہتا ہے

بہت خطا اُٹھاتا ہے دل تجھسے ملکر   قلق دیکھیے کیا ہوا چاہتا ہے
غمِ رشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم   سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے
بہت چین سے دن گذرتے ہیں حالیؔ
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

ق
جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے   آج دل لے گا اگر کل نہ لیا۔ یاد رہے
شوق بڑھتا گیا جوں جوں رُکے اُس شوخ سے ہم   یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے
ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر   نہ برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
یاد آؤگے بہت۔ لطف سمجھکر کیجیے   اس بھلائی کا ہے انجام بُرا۔ یاد رہے
شیخ یہاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے   توبہ اُنکی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے
وادیِ عشق میں موسیٰ کو ہو گر خصتِ دید   ہاتھ کٹوائیں جو پھر کفش و عصا یاد رہے
خضر نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا   بھول جائینگے رہِ آبِ بقا یاد رہے
دل بُری طرح لگا عشقِ بتاں میں اے شیخ   دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے
چارہ گر اکار باندازۂ تدبیر نہیں   کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے
ابھی جانا نہیں حالیؔ نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائینگے مزا۔ یاد رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے   آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
افسوس شبِ وصال سے کچھ کام کر نہیں   نالے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے

اے دل اب آزمایش تقدیر کا ہے وقت — وہ امتحان برّشِ شمشیر کر چکے
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے — ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز — دیکھا تو دل کو ہم ہدفِ تیر کر چکے
جاں لب تک انتظار میں آئی ہے بارہا — مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے
دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ — گویا کہ اک جہان کو تسخیر کر چکے

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

نہ وھاں پرسش نہ یھاں تابِ سخن ہے — محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُسکی — وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات — مگر ہر بات میں اک سادہ پن ہے
عدو سے بات محفل میں نہ کرنی — جو سچ پوچھو تو جائے سوءِ ظن ہے
بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار — تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے
دلاتی ہے صبا کسکو چمن یاد — نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے
کروں تجھسے بیاں کچھ دردِ غربت — مگر جوشِ سخن مہرِ دہن ہے
رہے لاہور میں آکر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے

8 یہ غزل تقریباً ۱۲۸۹ھ ہجری میں اُسوقت لکھی تھی جب کہ اول ہی اول بتقریب ملازمت دلّی چھوڑکر لاہور جانا پڑا تھا۔ اُسوقت اول تو دلّی سے جدا ہونا ہی سخت شاق گذرا تھا۔ دوسرے لاہور میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی۔ اور وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور وشور رہا۔ آخر کار راقم بھی سخت بیمار ہوگیا۔ اُس تنہائی اور سراسیمگی وغم واندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے تھے ۱۲

نہیں آتی کہیں یہاں بوئے یوسف　　مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے سقف و بام　　کہ بلبل ناشناساے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پرواے لیلی　　نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہکن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور　　تصوّر میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم　　خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس باغ کا پھول؟　　جہاں ہر گل بجاے خود چمن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس مصر کی بو؟　　جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی　　مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے
نہ لینے دیگا جنت میں بھی آرام　　یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے
گریں نظروں سے سب باتیں پرانی　　مگر الفت کہ اک رسمِ کہن ہے
بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی!!　　یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے

کیا ہے اُسنے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہمکو ابھی اسمیں سخن ہے

ق
دُھوم تھی اپنی پارسائی کی　　کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت　　ہمکو طاقت نہیں جدائی کی
مُنہ کہانتک چھپاؤ گے ہم سے　　تمکو عادت ہے خود نمائی کی

8 یہ غزل بھی لاہور میں اُسیوقت لکھی گئی تھی جبکہ غزل سابق لکھی گئی تھی۔ آخر کے اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے ۱۲

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں صلح میں چھیڑ ہی لڑائی کی
ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن ہم سے باتیں کرو صفائی کی
دل رہا پائے بندِ الفتِ دام تھی عبث آرزو رہائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے رکھیئے امید دل ربائی کی
شہر و دریا سے باغ و صحرا سے بو نہیں آتی آشنائی کی
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں رہ گئی شرم پارسائی کی
بختِ ہمداستانیِ شیدا¹ تو نے آخر کو نارسائی کی
صحبتِ گاہ گاہیِ رشکی² تو نے بھی ہم سے بیوفائی کی
موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے ساعت آپہنچی اُس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

کر دیا خوگرِ جفا تو نے خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے
دور پہنچی تھی اپنی آزادی پر خدا جانے کیا کیا تو نے
کیوں نہ آئیں گے یاں وہ اے ہمدم بس سنا میں نے اور کہا تو نے
گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج نہ کہا اور نہ کچھ سنا تو نے
صبر کا ہے بہت بُرا انجام ہم کو سمجھا ہے دل میں کیا تو نے

¹ شیدا سے مراد منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب دہلوی ہیں کہ اُس زمانہ میں کبھی کبھی فکر شعر کرتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے ۱۲
² رشکی آنریبل نواب محمد علی خاں بہادر رئیس جہانگیر آباد کا تخلص ہے ۱۲

ابتداے وفا ہے سر دینا   میری دیکھی نہ انتہا تو نے

دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل   اور کھویا رہا سہا تو نے

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک   ہمکو کس سے خفا کیا تو نے

جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالی اپنا کہا سنا تو نے

ق

کر کے بیمار دی دوا تو نے   جان سے پہلے دل لیا تو نے

رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا   اب لیا چشمۂ بقا تو نے

شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا   آکے مسجد سے کیا لیا تو نے

دور ہو اے دل مآل اندیش   کھو دیا عمر کا مزا تو نے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ   کیا کیا چشم آشنا تو نے

دل و دیں کھو کے آئے تھے سوئے دیر   یہاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے امید خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

ق

دل کو درد آشنا کیا تو نے   درد دل کو دوا کیا تو نے

طبع انساں کو دی سرشت وفا   خاک کو کیمیا کیا تو نے

وصل جاناں محال ٹھہرایا   قتل عاشق روا کیا تو نے

تھا نہ جز غم بلاے عاشق میں   غم کو راحت فزا کیا تو نے

جان تھی اک وبال فرقت میں　　شوق کو جاں گزا کیا تو نے

تھی محبت میں ننگ منتِ غیر　　جذبِ دل کو رسا کیا تو نے

راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی　۱　قطعہ　درِ میخانہ وا کیا تو نے

قطع ہونے ہی جب لگا پیوند　۲　غیر کو آشنا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ　　عشق کو رہنما کیا تو نے

ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی　　عقل کو ناخدا کیا تو نے

بڑھ گئی جب پدر کو مہر پسر　　اسکو اُس سے جدا کیا تو نے

جب ہوا ملک و مال رہزنِ ہوش　　بادشہ کو گدا کیا تو نے

جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد　　درد کو بے دوا کیا تو نے

جب دیا راہرو کو ذوقِ طلب　　سعی کو نارسا کیا تو نے

پردۂ چشم تھے حجاب بہت　　حُسن کو خود نما کیا تو نے

عشق کو تاب انتظار نہ تھی　　غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے

حرم آباد اور دیر خراب　　جو کیا سب بجا کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھی احباب　　ہم کو جادو نوا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب　　کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالی اُٹھا ہلا کے محفل کو　　آخر اپنا کہا کیا تو نے

اس شعر میں پدر و پسر کا اشارہ حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کی طرف اور اگلے شعر میں بادشاہ سے مراد ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ ہیں ۱۲

رباعیات

توحید

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا　　حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھکو۔ جانا ہے ضرور　　بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہو کھٹکا تیرا

ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مُغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ایضاً

طوفاں میں ہی جب جہاز چکر کھاتا　　جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا　　وہاں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور　　سنکر بھی پکار اُٹھتے ہیں تجھکو مجبور
خفاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ　　خورشید کا شش جہت میں پھیلا جب نور

توحید

جب یاس و ناامیدی دلوں پہ چھا جاتی ہے ۔ دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال ۔ لیکن انھیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

ایضاً

مٹی سے، ہوا سے، آتش و آب سے یہاں ۔ کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر۔ تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک ۔ گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

ایضاً

ہستی سے ہی تیری۔ رنگ و بو سب کے لیئے ۔ طاعت میں ہے تیری۔ آبرو سب کے لیئے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور ۔ سب اپنے لیئے ہیں اور تو سب کے لیئے

ایضاً

کیا ہو گی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد ۔ دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر۔ جو کہ ہیں تجھ سے لو لگائے بیٹھے ۔ رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

نعت

زہّاد کو تو نے محوِ تمجید کیا ۔ عشاق کو مستِ لذّتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی ۔ توحید کو تو نے آکے توحید کیا

ایضاً

8 یعنی جو کچھ اب تک ظاہر ہوا ہے وہ بمقابلہ اُسکے جو خزانۂ غیب میں مخفی ہے کان لم یکن ہے ۱۲

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا
اور اُمّیوں کو خیرِ اُمم تو نے کیا
اسلام نے ایک کردیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلّہ کو بہم تو نے کیا

ایضاً

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری اُبوّت سے شرف

صلحِ کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بَیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنّم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترکِ شعرِ عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہمکو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دُکھ میں کامرانوں کی طرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل اُن کے ہیں ظرف اُنکے جو کرتے ہیں ٹیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہو گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جاں ہے دیں پر قرباں پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایماں
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہاں

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے۔ پہ اتنی ہی خبر اک مشغلہ دلچسپ ہی بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھیرایئو بد اے فرزند ایک آدھ ادا انکی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں ہوں اُسمیں اگر گلے سڑے دانے چند

دوستوں سے بے جا توقع

تا زیست وہ محو نقشِ موہوم رہے جو طالبِ دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو مفتوں گردن پہ نہ لو عقل خداداد کا خوں
خود عہدِ شباب اک جنوں ہے اے تم کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور پر عیب سے بچئے تا بمقدور ضرور

عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو گھٹنے سے کہیں اُنکے نہ بڑھجائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ۔ زباں سے کہتے ہیں وہ کم ہوتے نہیں ساتھ جمع۔ دَمِ اَور قدم
بڑھتا گیا جسقدر کہ حسنِ گفتار بس اُتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مُفت یہ امکاں ہے۔ مگر عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

طالب کو سوچ سمجھکر پیر بنانا چاہیئے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفان و یقیں پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں نادان کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر آتا نہیں فرق اسکے سوا اُنمیں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجام ترقیِ بشر یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنسکر
باقی نہ رہیگا کوئی انسان میں عیب ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

دَمْ دعویٰ اور قَدَمْ عمل ۱۲

مسرف کو کیونکر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

اک منعم مسرف نے یہ عابد سے کہا — کر میرے لئے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ — محتاج کر اسکو جلد اے بار خدا

کام کی جلدی

یہاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے — آتا ہے اگر آج۔ تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام انکو جلدی بھگتاؤ — طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

غرض

ہے نفس میں انساں کے جبلی یہ مرض — ہر سعی پہ ہوتا ہے طلبگار عوض
جو خاص خدا کے لیئے تھے کام کیئے — دیکھا تو نہاں انمیں بھی تھی کوئی غرض

انقلاب روزگار

بن بن کے ہزاروں گھر اجڑ جاتے ہیں — گڑ گڑ کے علم لاکھوں اکھڑ جاتے ہیں
آج اسکی ہے نوبت تو کل اسکی باری — بن بن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضائے سن

حالی کو جو کل افسردہ خاطر پایا — پوچھا باعث تو ہنسکے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی امید — وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو — روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو

پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان　　اولاد کو سستی پہ قناعت کا گُمان

بچے آوارہ اور بے کار جوان　　ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان　　برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان

مایوس تھے جسکے جوتنے سے دہقان　　یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا　　شیریں سخنی سے شہد فائق ہونا

ممکن نہیں جب تک کہ نہو دل میں نفاق　　آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

مُسلمانوں کی بے مہری

جب تک کہ نہو دشمنِ اخواں پکّا　　ہوتا نہیں مومن کا اب ایماں پکّا

ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے　　سُنتے ہیں کسی کو جب مُسلماں پکّا

مکر و ریا

حالی رہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا　　خطرہ اُنھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا

لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر　　بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں
پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ
ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تونے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھیرایا تجھے راس المال

ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمۂ نعما و آبادی تو ہے
آسایشِ دو جہاں ہے سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

ایضاً

ہی تجھسے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیض تجھسے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کیطرح
رہتی ہیں شعاعیں تری محدود ہیں

خاندانی عزت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلت سے
عزت نہیں اُسکو باپ کی عزت سے
سوچو تو ہے ملکات کا نسب بھی عالی
پر اُسکو شرف نہیں کچھ اس نسبت سے

عزت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا۔ مجھسے ہی عزت ہی جہاں
فرمایا ہنر نے۔ میں ہوں عزت کا نشاں
عزت بولی غلط ہے دونو کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

توقع بیجا

ہیں یار رفیق۔ پر مصیبت میں نہیں   ساتھی ہیں عزیز۔ لیک ذلّت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث   جو نوعِ بشر کی خود جبلّت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی   اُتنی ہی مغائرت ہے یہاں اور خویشی
وہ دوست نہیں جس نے کیا فکرِ مآل   ضدّین ہیں دوستی و دوراندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے   ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں   کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

ایضاً

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا   سُلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل   بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں   بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اَوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں   خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

عشق

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ   پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ

دیکھا ہے سدا اسلامتی میں تیری
قوموں کو ذلیل۔خاندانوں کو تباہ

سببِ زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم
سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مُشیرِ دولت
یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

دین و دنیا کا رشتہ

دُنیا کو دیئے دین نے اسرار و حِکم
دُنیا نے کمر دین کی تھامی جبدم
گر دین کی ممنون بہت ہی دُنیا
دُنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

آزادگانِ راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ
کافر کہا واعظ نے انھیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جسوقت
لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار
اُس قوم کا جینا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں ہے جسکو ہرگز پروا
ذلت سے نہیں ہے جسکو ہرگز کچھ عار

عفو باوجودِ قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا

یعنی کفر و ضلالت ایسی چیزیں ہیں جن کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔مثلاً شیخ اکبرؒ کو بعضوں نے صدیق کہا ہے اور بعضوں نے زندیق اور یہ بات کہ وہ فی الواقع صدیق تھے یا زندیق خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔پس جس شخص میں کوئی صریح اخلاقی بُرائی یا عیب موجود نہو اُسکی تکفیر یا تضلیل کرنی ایسی بات ہے جیسے کسی جھوٹے مدعی کو شہادت نہ ملے اور وہ اپنے دعوے پر خدا کو گواہ قرار دے ۱۲

ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

سختی کا جواب نرمی ہے

فتنہ کو جہاں تلک ہو دیجے تسکیں
زہر اُگلے کوئی تو کیجے باتیں شیریں
غُصہ غُصّے کو اور بھڑکاتا ہے
اِس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

ہمّت

تیمور نے اک مور چسپہ زیر دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لیکر سو بار
آخر سرِ بام لیکے پہنچا تو کہا
"مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمت دشوار"

کم ہمتی

جبریّہ و قدریّہ کی بحث و تکرار
دیکھا تو نہ تھا کچھ اسکا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور
جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا
ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذّت سے ندامتوں کی جانا ہمنے
دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

تاسُّف بر وفات نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم نیّر تخلّص دہلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز
آتے ہی خزاں کے کرگئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبل زار
سو اُسکی بھی کل سے نہیں آتی آواز

ایضًا

غالب[8] ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اِسی کو بزمِ یاراں سمجھو یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں جہاں ہر اک دامن میں محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰؑ کو ملی نہ قوم کی چوپانی جب تک نہ چرائیں بکریاں مُدیَن میں

گدائی کی ترغیب

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا کی میں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ہے اسکا اُنکی گردن پہ وبال دے دیکے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

تکفیر اہلِ اسلام

کہنا فُقہا کا مومنوں کو بے دیں سُنتے سُنتے یہ ہوگیا ہمکو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا مرتد ہیں سوال تکفیر بھی کی تھی فُقہا نے کہ نہیں؟

ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہمسے سوگواری سُن لو کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سُن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں چاہو تو کتھا ہمسے ہماری سُن لو

تنزّلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے

[8] یہ اُن شعراے دہلی کے نام ہیں جنکے ساتھ راقم کو ربط اور اختصاص تھا ہے عام اس سے کہ وہ مشہور و نامور ہوں یا نہ ہوں ۱۲ (حالی)

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اول کوشش اور بعد دعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے پھر چاہیے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام ہمّت و بازو سے لیا[۸] پائی نہ نجات نوحؑ نے طوفاں سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے بنتی نہیں زندگی میں بیکام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب سمونے والے بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جنکی جیبوں میں مدام اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہُنر ہوں ذات میں جسکی ہزار بدظن نہو عیب اُسمیں اگر ہوں دوچار
طاؤس کے پائے زشت پر کرکے نظر کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

سکوتِ درویشِ جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ مونہ سے یا نہ بولیں حضرت معلوم ہے ہمکو جتنے پانی میں ہیں آپ

۸- یعنی جب تک کہ کشتی نہ بنائی ۱۲

ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اک منکر قرآن و خبر — کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں، ورنہ — کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اک گور پرست نے یہ دہری سے کہا — ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھسا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر — اس سے بھی گیا کہ جسکے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت نہو جب کانوں میں — دانائی کی باتوں میں اور فسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جسطرح — دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی — کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ — دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سنکر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور — داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سنکر ناخوش — مقصود یہ ہے کہ ہو ستایش کچھ اور

حسن ظن اصل حال نہیں کھلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں — نیکی میں شک اسکی کوئی لایا ہی نہیں

ہو سکتہ رنج میں بھی شاید کچھ کھوٹ
پر اُسکو کسی نے یہاں تپایا ہی نہیں

دینداروں کی بُرائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حالِ اہلِ اسلام
اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بدپرہیزی سے بگڑے اپنے بیمار
اور مُفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

فکر عقبیٰ

منزل ہے بعید۔ باندھ لو زادِ سفر
مواج ہے بحر۔ رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے۔ لیچلو مال کھرا
ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگذر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں
ممکن ہے۔ بدی کا نہ رہے اُسمیں نشاں
ممکن تو ہے سب کچھ۔ پہ حقیقت یہ ہے
انسان ہے ابتک وُہی قرنُ الشیطاں

سلاطین کا عشق

ہر چند بُرا ہے عشق کا سب کے مآل
پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سُلطاں ہو اگر ظلِ الٰہی تو عشق
ہے ظلِ الٰہی کے لیئے وقتِ زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ
پر تجھسے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی
پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

بڑھاپے میں موت کے لیئے تیار رہنا چاہیئے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیتِ شب اُٹھا چکے، اب حالی
مجلس کرو برخاست۔ ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جسطرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک
ہے جوہرِ انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابلِ عفو ہے

غُصّہ پہ کسی کے غُصّہ آتا ہے وہیں
جب تک کہ ہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہوگیا تو باہر
پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

سُفہا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری
کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر (نصیبِ اعدا)
رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لاعلاج ہے

اب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جسکا پانا ہے محال
آتا ہے وہ وقت جسکا ٹلنا معلوم

اسراف

مُسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رایگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں۔ بہتر ہے
اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

ردِّ سُوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے۔ نہ صواب
زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار لے دُوں ہمت
سائل کے سُوال سے ترا تلخ جواب

کھانا بغیر بھُوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آتے ہیں ہمیں
جو دیکھکے ۔ چکھکے ۔ دل سے بھاتے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھُوک
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جیسے مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

اچھوں کو بُرا سُننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
جو کر کے بھلا ۔ خلق سے سُنتے ہیں بُرا
ان گالیوں کا ہے جنکو چسکا حالیؔ
آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

شکریۂ مدحِ کلام راقم

جوشِ خُمِ بادۂ جامِ خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
تسلیمؔ نے دی کچھ اسطرح دادِ سخن[*]
مجھکو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

[*] مولوی سلیم الدین مرحوم نارنولی مقیم جے پور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستایش میں اُسوقت بھیجے تھے ۔ جب کہ مدت سے فکرِ شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا ۔ اُن قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی ۱۲

احساں کے ہی گر صلہ

کرتے ہو گر احسان تو کر دو اُسے

قانون بد اخلاقی سے مانع نہیں

قانون ہیں بیشتر یقیناً بیکار — حاشا کہ ہو انپہ نظم عالم کا مدار

جو نیک ہیں اُنکو نہیں حاجت انکی — اور بد نہیں بنتے نیک اِنکے زنہار

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں — بھڑکے گی مدافعت سے اور آتش

گر چاہتے ہو کہ چُپ رہیں اہلِ خلاف — جز ترکِ خلاف

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل — اک وقت

کی عرض یہ اک سیٹھ نے اُٹھکر کہ حضور — ہے ٹیکس کا

انسان اپنے عیب اپنے سے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں — اور

اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے — بہ

بڑھاپے میں عاشقی

آئیں پیری میں شیخ ابھرتے نہیں یوں

اسطرح وہ مرتے نہیں ایوں

...اعظ نے درشتی سے کیا اُس سے کلام
...ہوں جسکے   ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

نواب وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق نے اُنکی چھوڑ دی ہمراہی   اقبال پہ جس نے فتحیابی چاہی
حالی لے جائے کون بازی اُنسے   ہے جنکی رگوں میں خون آصفجاہی

...ات قدیم

...ز کی عادت   مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
...یں جانا   عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

...لنگے   جب یاد کرینگے مجھے تب روئینگے
...)   آگے نہیں روتے تھے تو اب روئینگے

...الملک بہادر مبئی سے پولو میں بازی جیت کر آئے تھے۔ لکھی تھی نگر انکی خدمت
...حضور سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں اُنکے خطاب کی طرف اشارہ ہے

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گذرے
اک خستہ جگر کی رات کیونکر گذرے
گذری نہو جس بغیر یہاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیونکر گذرے

یاد اُس کی یہاں وردِ مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجئے کہ ہے نام اُس کا
کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے

کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزید گمراہ !!
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

حُرؔ کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
گمرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگی کوئے ضلالت کب تک؟
اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا
اک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید
وھاں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

قصیدے ترکیب بند مسدس اور قطعے مختلف مضامین پر بہ ترتیب اوقاتِ تحریر

۱۔ قصیدۂ نعتیہ

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لیئے — سخن زباں کے لیئے اور زباں دہاں کے لیئے
وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں — عداوت اُس کی عذابِ الیم جاں کے لیئے
وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام — محبت اُس کی حصارِ حصیں اماں کے لیئے
وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم — رہا نہ تفرقہ روز و شب زماں کے لیئے
وہ پھول جس سے ہوئی سعی باغباں مشکور — رہی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کے لیئے
ہلال مکہ کا۔ ماہِ دوہفتہ یثرب کا — فروغ قوم کے۔ اور شمع دودماں کے لیئے
گھر اُس کا موردِ قرآں و مہبطِ جبریلؑ — در اُس کا کعبۂ مقصود انس و جاں کے لیئے

8 یہ قصیدہ ۱۲۸۱ یا ۱۲۸۲ ہجری کا لکھا ہوا ہے اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اسکو اپنی قدیم شاعری کا نمونہ سمجھکر بدستور سابق رہنے دیا ہے کہیں کچھ تصرف نہیں کیا گیا ۱۲

سپہر گرمِ طواف اُس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اُسکے آستاں کے لیئے

وہ لحظہ لحظہ تفقد وہ دمبدم الطاف
رضاے خاطرِ یارانِ جانفشاں کے لیئے

وہ گونہ گونہ مُدارا وہ بات بات میں مہر
کشایشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لیئے

گہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے
گہ انکسار مُدارات میہماں کے لیئے

کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لیئے

صفاے قلب حسُودانِ کینہ خواہ کے ساتھ
دعاے خیر بداندیش و بدگماں کے لیئے

کہیں مقدمۃ الجیش انبیا و رُسُل
کہیں وہ خاتمۃ الباب داستاں کے لیئے

مدینہ مرجع و ماواے اہلِ مکہ ہوا
مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیئے

اسی شرف کے طلبگار تھے کلیم و مسیح
نوید اُمتِ پیغمبرِ زماں کے لیئے

بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہزن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لیئے

شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہی
بشارت اُمتِ عاصی و ناتواں کے لیئے

شفاعتِ نبوی ہے وہ برقِ عصیاں سوز
کہ حکمِ خس ہے جہاں کفر و وجہاں کے لیئے

خدا کی ذات کریم اور نبی کا خُلق عظیم
گنہ کریں تو کریں خصمت انس و جاں کے لیئے

اُسی کا دیں ہے کہ ہے گلشنِ ہمیشہ بہار
وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لیئے

عبورِ لُجۂ عصیاں سے کسطرح ہو اگر
وہ ناخدا نہو اس بحرِ بیکراں کے لیئے

مریضِ حرص و ہوا پائے کب شفا جبتک
وہ چارہ گر نہو اس دردِ جانستاں کے لیئے

نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام و لب میں سکت
حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیئے

ارادہ عرش تک اک آن میں پہنچنے کا　　کیا تھا عزم اولوالعزم نے کہاں کے لیے
کرم کا دیکھیے دامن کہاں تلک ہو فراخ　　ہو میزبان خدا جب کہ میہماں کے لیے
زمیں پہ ٹھیرا ہے ماوائے شاہِ عرش نشیں　　رہی نہ اب کوئی فوقیت آسماں کے لیے
اِسی سے ہوتا ہے ظاہر عیارِ استعداد　　محک ہی حُبِّ نبیؐ دل کے امتحاں کے لیے
اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ　　پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسّر آئے　　کروں نہ طولِ اَمَل روضۂ جناں کے لیے
سمایا اُس کا جو نقشِ قدم تصور میں　　ہجومِ شوق میں بوسے کہاں کہاں کے لیے
حریفِ نعتِ پیمبر نہیں سخن **حالی**　　کہاں سے لائیے اعجاز اِس بیاں کے لیے
نبیؐ کا نام ہو وردِ زباں - رہے جب تک　　سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

۲- ترکیب بند - مرثیہ ۱۲۸۵ھ ہجری

مرثیہ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ غالب

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی　　وقت کوتاہ و قصّہ طولانی
عیشِ دُنیا سے ہو گیا دل سرد　　دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال　　گوشۂ فقر و بزمِ سُلطانی
ہے سراسر فریبِ وہم و گماں　　تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب　　جامِ جمشید و راحِ ریحانی

لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک ڈھکوسلا ہے لحنِ داؤدی اک تماشا ہے حسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں۔

جس سے دنیا نے آشنائی کی اُس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ ہاں قسم مجکو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اِس کی صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِ وصل سے محروم جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے شان ہو جس میں دلربائی کی
جنس کاسد سے ناروا تر ہے خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خانِ غالب مُرد

بُلبلِ ہند مر گیا ہیہات / جسکی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس / پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج / رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اُسکا ایک ٹھٹول / سو تکلف اور اُسکی سیدھی بات

دل میں چُبھتا تھا وہ اگر بمثل / دن کو کہتا دن اور رات کو رات

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھّا / قلم اُسکا تھا اور اُس کی دوات

تھیں تو دلّی میں اُسکی باتیں تھیں / لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اُسکے مرنے سے مر گئی دلّی / خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یہاں اگر بزم تھی تو اُس کی بزم / یہاں اگر ذات تھی تو اُسکی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اُسکی یاد آئیں / کس کی باتوں سے دلکو بہلائیں

کس کو جا کر سُنائیں شعر و غزل / کس سے دادِ سخنوری پائیں

مرثیہ اُس کا لکھتے ہیں احباب / کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ اُستاد / کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں / اہلِ میّت جنازہ ٹھیرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو / سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں

اُسکو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں اُنکو ٹھہرائیں
ہمنے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط مونہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حُسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت
قال اُس کا وہ آئینہ جسمیں — نظر آتی تھی حال کی صورت
اُس کی توجیہ سے پکڑتی تھی — شکلِ امکاں محال کی صورت
اُس کی تاویل سے بدلتی تھی — رنگ ہجراں وصال کی صورت
لطفِ آغاز سے دکھاتا تھا — سخن اُس کا مآل کی صورت
چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے — انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے — غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا　　رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع　　رخصتِ موسمِ بہار ہے آج
بارِ احباب جو اُٹھاتا تھا　　دوشِ احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی　　اُسکی چپ سے جگر فگار ہے آج
دلمیں مدت سے تھی خلش جسکی　　وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دلِ مضطر کو کون دے تسکیں　　ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج
تلخیٔ غم کہی نہیں جاتی　　جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر　　ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقدِ معنی کا گنجداں نہ رہا　　خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اُسکے گئی بہارِ سخن　　اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا ایک ایک کارواں سالار　　کوئی سالارِ کارواں نہ رہا
رونق حسن تھا بیاں اُس کا　　گرم بازارِ گلرخاں نہ رہا
عشق کا نام اُس سے روشن تھا　　قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں　　گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہلِ ہند اب کرینگے کس پہ ناز　　رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نام ملوک | بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا | وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اُٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن
کسکو ٹھیرائیں اب مدار سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا | اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اُس نے ادا | پر کوئی اُس کا حقگزار نہ تھا
بے صلہ مدح وشعر بے تحسیں | سخن اُس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذر سائل تھی جان تک لیکن قطعہ | درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہوا ۲ | جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی | سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا | دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے | زہد اُس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست وخراب | ہمنے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیّت تھا

کچھ نہیں فرق باغ وزنداں میں | آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیت حزن | ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں — اک فلاطون نہیں جو یونان میں

ختم تھی اک زبان پہ شیرینی — ڈھونڈتے کیا ہو سیب و رُمان میں*

لب جادو بیاں ہوا خاموش — گوش گل وا ہے کیوں گلستان میں

گوش معنی شنو ہوا بیکار — مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستان میں

وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستان میں

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر — سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہان میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت

آبِ حیوان پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائیگا اب کون — سکہ اپنا بٹھائیگا اب کون

ہمنے جانی ہے اُس سے قدرِ سلف — اُن پر ایمان لائیگا اب کون

اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اُسکو دل سے بھلائیگا اب کون

تھی کسی کی نہ جس میں گنجایش — وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون

اُس سے ملنے کو یہاں ہم آتے تھے — جا کے دلّی سے آئیگا اب کون

مر گیا قدر دانِ فہم سخن — شعر ہمکو سنائیگا اب کون

مر گیا تشنۂ مذاقِ کلام — ہمکو گھر سے بُلائیگا اب کون

تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک — ہمکو چالیں بتائیگا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی — غزل اُسکی بنائیگا اب کون

* مصرعہ: اک زبان میں اُنکی تھی * یا وہ حرف سے عشق و درد جہاں میں

کَمْ لَنَا فِیْہِ مِنْ بُکَیً وَّعَوِیْل
وَعِتَابٍ مَعَ الزَّمَانِ طَوِیْل

۳۔ قصیدہ نعتیہ

میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور | مجھسے اُٹھینگے اُنکے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ | مجھسے برتر ہے میری طبعِ غیور
خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے | میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
نہ گنو اہلِ عصر میں مجھکو | میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
چشمۂ آبِ خضر کی مانند | چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت | مجھکو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثلِ یوسف دکھائے جوہرِ ذات | جسکو بکنا ہو مفت یہاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر ۱ | ہوں زمانہ کے ہاتھ سے مجبور
ٹبک و قمری کو رخصتِ پرواز ۲ | بال و پر بغنت صعوہ و عصفور

۸ اس قصیدہ کی تمہید ۱۲۷۸ھ یا ۱۲۷۹ھ کے ہذیانات میں سے ہو۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلّی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن ذوق۔ آزردہ۔ غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھیں دنوں میں سیتا رام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوی سے لکھیں۔ جن دوستوں کی جا و بیجا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرہ میں نہ آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہ ہوتی ہوگی جیسا کہ شاعر اُن لوگوں کی بے التفاتی سے جنکو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدر دان سمجھتا ہے۔ اُسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدہ کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیونکہ اُس زمانہ کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جسطرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعہ سے ہوتی ہے اسیطرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعۃً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا۔ لہذا قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیئے ایک وجہ پیدا ہو جائے ۱۲

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں | اُس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور
لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ | اُسکو کیا قدرِ خوشۂ انگور
جسکے آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے | روزِ روشن ہے یا شبِ دیجور
پہلے ہو گی کسی کو قدرِ ہنر | اُٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور
دردِ دل کا بیاں کروں کس سے | بات کھونی نہیں مجھے منظور
سخنِ حق کی داد لوں کس سے | سُن چکا ہوں فسانۂ منصور
دلِ آباد مفتِ بے ہُنراں | ہو چُکا خانۂ ہُنر معمور
مژدہ خسرو کو وصلِ شیریں کا | ہو چکی سعیِ کوہکن مشکور
ہمنے دیکھی تمیزِ اہلِ نظر | ہمنے دیکھا مذاقِ اہلِ شعور
ہے غرض ان کو صوتِ موزوں سے | نالۂ دل ہو یا نوائے طیور
ہو کسی شے سے اِنکی گرمیِ بزم | داستاں ہو وہ یا کہ درسِ زبور
ہے فقط روشنی سے انکو کام | موم ہو اصلِ شمع یا کافور
ہے یہاں قائلِ اَنا مردود | ہو وہ فرعونِ وقت یا منصور
آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ | دلِ اصحاب گو نہ ہو مسرور
یھاں اگر کام ہے تو شیریں سے | قصرِ خسرو کے اَور ہیں مزدور
دلِ احباب پر نہیں چلتا | سحر میرا کہ رہیو غیر سے دور
ہوں تماشائے شہر نابینا | ہے برابر مرا خفا و ظہور

دُرِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور
چشمہ پیدا و کارواں تشنہ بادہ پرزور و انجمن مخمور
اس زمانے میں وہ غریب ہوں میں جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور
صاحبِ قدر و جاہ ہے جبتک کارفرما ہے چین میں فغفور
کاش اُس عہد میں مجھے پاتے تھا سخن جب کہ قبلۂ جمہور
کاش وہاں دیکھتے مجھے کہ جہاں متنبّی تھا مادحِ کافور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز انوری ہے نہ عرفی و شاپور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار مرگیا عندلیبِ[8] نیشاپور
جس سے ہوتا ہی خستہ سینۂ ہوش ہے زباں میری تیغ وہ مِسطور
جس سے ہوتا ہے کور پروانہ ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور
شرحِ نقطہ کی گر کروں تحریر تنگ ہو عرصۂ نقوشِ مسطور
ترکِ عشقِ بتاں کریں عشّاق مجھ سے سُن پائیں گر ستائشِ حور
گر کروں ذکرِ لذّتِ طاعات تلخ کردوں مذاقِ فسق و فجور
چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد دلِ خسرو میں ڈالدوں ناسور
کرنے جاؤں جو حق سے عذرِ گناہ لے کے آؤں نویدِ عفوِ قصور
لوں ملائک سے دادِ حُسنِ کلام گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور

[8] عندلیب نیشاپور سے مراد نظیری ہے۔ لیکن اگر وہ ہوتا تو اس سے زیادہ اور کیا قدر کرتا جیساکہ شیخ علی حزین نے سودا کی نسبت کہا تھا کہ در پوچ گویاں ہند غنیمت ست ۱۲

وہ شہنشاہ۔ اُمتی جس کا یہاں گنہگار اور وہاں مغفور
وہ خداوند۔ خدمتی جس کا یہاں سبکسار اور وہاں ماجور
مژدہ اے اُمتِ ضعیف کہ یہاں سعی ہوتی ہے بے کیئے مشکور
لبِ شیریں کلام سے اُس کے دوست بھی شاد غیر بھی مسرور
اثرِ فیضِ عام سے اُس کے کعبہ آباد و میکدہ معمور
چرخ کو دے اگر وہ حکمِ سکوں ہو غلط نسخۂ سنین و شہور
صرصرِ قہر گر چلے اُس کی بند ہو مسلکِ صبا و دبور
جس طرف ہو وہ گرمِ نظارہ جلوہ گر ہو اُدھر سے لمعۂ طور
ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن موجزن ہو وہاں سے چشمۂ نور
بات پوچھو تو سوئے چرخ نگاہ سینہ دیکھو تو علم کا گنجور
ہو سکے اُسکی خوبیوں کا شمار نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
اے ترا پایہ فہم سے برتر اے ترا نام عرش پر مسطور
میں ترے در پہ سُن کے آیا ہوں نام تیرا شفیعِ روزِ نشور
کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے مگر اُمیدِ عفوِ ربِّ غفور
طبع غالب ہے اور میں مغلوب نفس قاہر ہے اور میں مقہور
بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور
چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور

مہرِ فرزند و خواہشِ زر و سیم　　طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور
ایک بیمار اور سو آزار　　ایک رنجور اور سو ناسور
نفسِ امّارہ اور دیوِ مرید　　یہ ہے افعی تو وہ ہے کلبِ عقور
مجھ سے جو کام چاہیے لیجے　　جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور
حسد و بغض و غیبت و بہتاں　　بخل و حرص ہو و فسق و فجور
ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی　　ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور
دل لگے بندگی میں کیا امکاں　　لب پہ ہے ذکرِ حق میں کیا مذکور
مایۂ عقل ہے نہ شورِ جنوں　　دلِ بیتاب ہے نہ جانِ صبور
نہ معاصی میں تلخیٔ خجلت　　نہ عبادت میں چاشنیٔ حضور
فی المثل ہے مری مسلمانی　　جیسے زنگی کا نام ہو کافور
ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے　　تیرے زمرے میں گر ہوا محشور
جب ترے کارواں میں جا پہنچا　　پھر رہا بابِ خلد کتنی دور
دوریِ آستان والا سے　　ہے بہت تنگ حالی مہجور
اب دعا ہے اے شفیعِ امم　　بسکہ بیتاب ہے دلِ رنجور
جا لگے تیرے در پہ کشتیٔ عمر　　جب کروں بحرِ زندگی سے عبور

جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

۴ قصیدۂ مدحیۂ ناتمام [8]

نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رام پور کی شان میں

ظلِ حق کلب علیخاں جسکے بذل و جود پر ۔۔۔ ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا
صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکامِ دیں ۔۔۔ زائرِ قبرِ نبیؐ اور حاجیِ بیت الہدےٰ
شاعری میں فرد موسیقی میں فارابی عصر ۔۔۔ صوت روح افزا و صورت آیۂ صنعِ خدا
دولتِ برطانیہ پر اُس کی فرزندی کا حق ۔۔۔ دولتِ عثمانیہ کو اُس سے پیوندِ وِلا
اسکی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب اور جلیس ۔۔۔ اور مروت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا
قطعہ
مرجعِ اربابِ علم و فن ہے اُسکا بابِ فیض ۱ ۔۔۔ یہ وہ دعوٰی ہے کہ خود دربار ہے اسکا گوا
گلزمینِ ہند میں تھے جو درختِ باردار ۲ ۔۔۔ اُن کو چُن چُن کر یہاں لا یا چمن بندِ سخا
گر مناظر ہیں تو ہیں سرِ دفترِ اہلِ کلام ۳ ۔۔۔ اور محدث ہیں تو ہیں سرچشمۂ علم و ہدےٰ
زمرۂ اہلِ یقیں یا مجمعِ اہلِ سلوک ۴ ۔۔۔ نکتہ چینانِ مجسطی خردہ گیرانِ شفا
شاعرِ شیریں نفس یا شاطرِ سنجیدہ رائے ۵ ۔۔۔ فیلسوفِ مستدل یا عارفِ علت رُبا
بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اِس باغ میں ۶ ۔۔۔ بلبلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا

---

[8] یہ قصیدہ ۱۲۹۱ھ میں اُس وقت لکھا گیا تھا جبکہ نواب ممدوح علی گڈھ کے مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے اور بارہ سو روپیہ سال کی جاگیر ہمیشہ کے لیئے مدرسہ کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپیہ نقد بطور چندہ کے دے چکے تھے مگر مصلحتہً اُن کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لیئے ناتمام رہا۔ اسکے اول و آخر کے کچھ اشعار ضائع بھی ہوگئے ہیں ۱۲

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلادِ دور دست
اے خوشا وہ سرزمیں جسپر ہو تو فرماں روا

بارِ محصولات سے یہانتک ہوئی ہلکی کہ اب
بارِ منت سے ترے پشتِ رعیت ہے دوتا

خیر تیری۔ ہے حصارِ عافیت تیرے لیئے
سیر ہو کر تجھکو دیتے ہیں بہت بھوکے دعا

نعمتیں حق کی نہ سمٹینگی سمیٹی زینہار
ہر بھلائی کی ملی وہ چند گر تجھکو جزا

خوانِ نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم
نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ کا

ہے یقیں تجھپر پڑے اصحابِ محشر کی نگاہ
جب کہیں۔ کسنے کیا حق میزبانی کا ادا

دولت و اقبال روز افزوں سے تیرے ہی عیاں
جو کہ حامی قوم کے ہیں اُن کا حامی ہے خدا

پرورش پاتی تھی جسکے سایۂ دولت میں قوم
لے گئی اُن کو بہا کر موجِ سیلابِ فنا

کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر
ہند میں اب تکیہ گاہِ امتِ خیر الورے

یہ اگر بنتے نہ کشتیبان اس طوفان میں
کشتیِ اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا

رہ گئی تیری خریداری سے شرمِ اہلِ فضل
ورنہ اُن کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا

رل گئے تھے گوہرِ درجِ شرافت خاک میں
خاک سے تو نے اُٹھایا اُن کو اور بخشی جلا

ہو رہے تھے دودمانِ علم و دولت جاں بلب
تو نے ایک اک کے چوایا حلق میں آبِ بقا

ٹونک میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم
آبیاری سے ہے تیری ہی اُسے نشو و نما

ہے یہ وہ احسان جسکے بارِ منت سے کبھی
قوم کی گردن نہ ہلکی ہوگی بے روے و ریا

تیرے ظلِ تربیت میں گر رہا یہ نونہال
ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اسکی طوبیٰ سے سوا

فرض اگر کیجیے اسے دیوارِ کاخِ آرزو
تو وہ پشتیباں ہے جس سے اسکی قائم ہے بِنا

اور اگر کہیے کہ ہے یہ قوم کی کشتِ مراد
تو ہے اُس پر ابرِ رحمت کی طرح چھایا ہوا

۵- قصیدۂ ناتمام مرقومہ سنہ ۱۲۹۴ ہجری

سر سید احمد خاں دام بقاؤہم کی شان میں

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کُھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہاں اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ رہ یہاں سے کب کا نکل گیا ہے

اس پر بھی اے عزیزو۔ ہے جائے فخر تم کو
دینوں میں دین بیضا حق نے تمھیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمھارا جو گھر ہے سب سے پہلا
ہادی ہے وہ تمھارا جو ختم انبیا ہے

دی ہے وہ مُصلحِ کُل حق نے کتاب تم کو
جس نے شریعتوں کو شیر و شکر کیا ہے

بخشی تمھیں حکومت حکمت تمھیں عطا کی
دَوراں سدا موافق تم سے یونہیں رہا ہے

اِس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اُس پہ قوم کے ہیں۔ وہ قوم کی سپر ہے
قوم اُس سے بدگماں ہے۔ وہ قوم پر فدا ہے

درہم سے اور قلم سے۔ دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اُس نے وہ کس سے ہو سکا ہے

۵- یہ قصیدہ اُس وقت لکھنا شروع کیا گیا تھا جب کہ مدرسۃ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سر سید کے کام تعجب کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ مگر بسبب مکروہات دنیوی کے پورا نہ ہو سکا ۱۲

ہمدردِ قوم ایسا ہمنے سُنا نہ دیکھا — یہ درد اُسکو جاں کی میراث میں ملا ہے
تعلیم کی تمھاری بنیاد اُسنے ڈالی — ملکوں میں جسکا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرونِ اولیٰ کسنے کیا بتاؤ — سیّد نے کام آکر جو قوم میں کیا ہے

۶ـ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۳ ہجری

مرثیہ مہیں برادر راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم

گل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھکے چُپ چُپ — حالی سے کہا ہمنے کہ اے بحرِ معانی
خاموش کبھی ہمنے تجھے یوں نہیں دیکھا — کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی
شادی میں تری تہنیتیں ہمنے سُنی ہیں — ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی
ہنسنا ہے نہ رونا ہے نہ نالہ ہے نہ نوحہ — کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تونے ہے ٹھانی
دنیا ہے یہ اک دارِ فنا۔ جس کا اثاثہ — سب خاک ہے تا انجم و افلاک ہے فانی
ہو جائے گر انساں یونہیں ہر رنج میں خاموش — کس طرح دلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی
اک آہ بھری سُن کے یہ حالی نے کہ جس سے — دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی
فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ — ساحل پہ ہیں جو راہ سپرِ قاصی و دانی
حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت — مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
آتے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے — موت ایک سے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی — غم بھائی کا مر جانے کی ہے اُسکے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کیطرح بھائی کو پالا | سوکھی ہوئی کھیتی ہیں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اُس نے سنبھالا | جس بھائی کے سایہ میں کٹی اُسکی جوانی
شفقت نے دیا جسکی بُھلا مہر پدر کو | دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتا بھی رہا بھائی گر اُس بھائی کے پیچھے | لذت نہیں جینے سے نصیب اُسکو اُٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جسکا عزیزو | کیا ڈھونڈتے ہو اُسکی طبیعت میں روانی
یہ چُپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ | یہ چپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی
بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں | یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لنگھانی
پر آہ۔ کلی وہ جو ہے مُرجھا گئی دل کی | مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپسمیں کھلانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر | ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۵ ہجری

بجناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

آسماں جاہ کی خدمت میں حالی کی یہ عرض | کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اِس کا کہ مجھے گھر بیٹھے | اُس نے ممتاز کیا بھیجکے شاہی فرماں
نہ ہوئی مجھسے کوئی خدمتِ سرکارِ نظام | نہ کیا میں نے کبھی طوفِ درِ صدرِ زماں
نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لایقِ قدر | اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں
حق نہ تھا دولتِ عالی پہ کوئی حالی کا | جسکے جلدو میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں

ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی — ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں

ہیں مربی ہنر و بے ہنری کے جسطرح — خار و گل دونو کو کرتا ہے نہال آب رواں

آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گزار — ملک میں اُسکا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جواں

یہاں وہ اُن کھیتیوں کو دیئے گیا ہے پانی — آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں

قوم اسوقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج — ہے وہ عالم پہ ہویدا۔ نہیں محتاج بیاں

عزت۔ آسودگی اور ملت و مذہب اُن کا — ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں

پھر نہ قدر اُنکی کچھ آنکھوں میں خلایق کی بلند — اور نہ وزن اُن کا ترازو میں حکومت کی گراں

آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے — درد کا جان لیا اُن کے کہ یہ ہے درماں

مدرسے قوم کے اِس ملک میں جو ہیں ممتاز — جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشاں

اُن کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم — چشم عالم میں مسیحائی پہ اپنی برہاں

کرتے ہیں زندۂ جاوید بنی نوع کو۔ جو — بذل کرتے ہیں پئے تربیت اہل زماں

ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی۔ جس کا — ملک پر قوم پہ تادیر رہے گا احساں

یہی بخشش ہے یہی جود ہے راس الحسنات — جس پہ موقوف ہے بہبودی نسل انساں

یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز — یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں

یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف — یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سبک جس سے گراں

دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل — کی ہمیشہ کے لیئے ایک نے وھاں نہر رواں

اُس کی خواہش تھی کہ ہوتے رہیں پیاسے سیراب — اِس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں

برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں
نہر جاری سے ہے ذات اُنکی سوا فیض رساں

بخت اُس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر
حامیِ علم و خریدارِ کمالِ انساں

اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جبتک
شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احساں

آسماں جاہ سے ہو تقویت ملک دکن
اور رہے ملک دکن ملجا و ماوائے جہاں

دولتِ قیصری و دولتِ آصفجاہی
ایک کی ایک زمانہ میں رہے پشتیباں

۸- قصیدہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۶ ہجری

تہنیت عید الفطر بہ جناب نواب سر آسماں جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا
خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا

کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے
کہ اپنے صبر کا انعام سب نے بھر پایا

رہین منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام
کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا

گئے ہیں اپنے مساجد سے معتکف خوش خوش
کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا

شگفتہ آتے ہیں اسطرح عیدگاہ سے لوگ
کہ گنج اُنھوں نے ہے گویا خدا سے پایا

حسین چاؤ میں پھولے نہیں سماتے آج
کہ دن خدا نے نمایش کا اُن کو دکھلایا

عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم
خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا

حکیم ہیں متفکر نہ زاہد افسردہ
خوشی نے دی ہے زمانہ کی کچھ پلٹ کایا

غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کھال میں مست
ہے ایک خوان سے منعم نے سب کو چکھوایا

اُدھر ہے فصلِ بہار اور اُدھر ہے عید الفطر　　سماں نشاط کا ہی شہر و دشت پر چھایا

کِھلے ہیں اُس کے عوض دشت میں کروڑوں پھول　　جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہی کُملایا

ہزاروں سروِ خراماں ہیں شہر میں ہر سو　　جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مُرجھایا

اگر خوشی کا زمانہ کی ہے یہی عالم　　تو سمجھو غم کا عوض غم زدوں نے بھر پایا

مگر یہ عارضی انبساط ہے سب ہیچ　　اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اِترایا

فریفتہ ہوئے جو ایسی ایسی خوشیوں پر　　اُنھوں نے آب کا دھوکا سراب پر کھایا

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی اُنکی　　جنھوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا

جنھوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما　　جنھوں نے علم کا بجھتا چراغ اُکسایا

جنھوں نے مُلک کے امراض کو کیا تشخیص　　جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا

جنھوں نے خُلق سے اپنا بنایا غیروں کو　　جنھوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا

خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم　　کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا

ہوا زمین پہ جس سال آسماں مُمسِک　　مینہ اپنی داد و دہش کا اُنھوں نے برسایا

ہواے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد　　فضاے دہر کو خُلقِ حسن سے مہکایا

سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار　　لیا سنبھال اُسے جس نے ہاتھ پکڑایا

ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا　　نہ مانگ سکتے تھے جو اُنکے گھر پہ پہنچایا

نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھکر　　اُنھوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا

نہ پائی کھانے میں لذت نہ چین سے سوئے　　ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وغا میں شیر مگر وقتِ رحم موم ضعیف — کسی کی آہ سنی اور دل اُن کا بھر آیا
وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج — جو شاہراہ میں پتا کسی نے کھڑکایا
وہ چونک اُٹھے کہ گویا قیامت آپہنچی — جو در پہ آکے کوئی دادخواہ چلّایا
نشاط و عشرتِ جاوید کی ہے انکو نوید — دل ایسا جنکو عنایت خدا نے فرمایا
سُنا تھا کان سے جو ذکرِ خیرِ عہدِ سلف — سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا
بشیرِ دولت و دیں صدرِ اعظم اُمرا — نہیں ہے جسکا کوئی قربِ شہ میں ہمپایہ
جو ظلِ حق ہے رعیت کے سر پہ شاہِ دکن — تو اعظم الامرا ظلِ حق کا ہے سایہ
ہمیشہ جسکو ہے بہبودِ ملک مدِ نظر — رفاہ و امن ممالک میں جسنے پھیلایا
اُٹھایا فتنہ نے جب سر فرو کیا اُسکو — پڑا عمل میں جہاں عقدہ اُسکو سلجھایا
بنا سے نظم و نسق جسنے رکھی شورے پر — مشیرِ کار خرد پروروں کو ٹھیرایا
دکن کو جسنے کیا مرجعِ خواص و عوام — دکن کا جسنے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا
نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرماں — جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا
بل انتظام کے رشتہ میں پڑ رہے تھے بہت — سو تکلے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا
لگا گئے تھے وزیرانِ رفتہ جو پودا — وہ صاحبی ہیں وزیرِ زماں کی پھل لایا
ترقی اب یہ تمدن میں کی ہے بلدہ نے — کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہی شرمایا
زمانِ حال سے ماضی کو دیکھیے کیا نسبت — اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا
خدا دراز کرے عمرِ اعظم الامرا — دکن کو جسکی حکومت نے دن یہ دکھلایا

زمیں پہ سایہ فگن جب تک آسمان رہے — رہے دکن پہ حضور نظام کا سایہ

تھی کوئی چیز نہ حالی کے پاس لائق نذر — سو یہ چگانہ ناچیز پیشکش لایا

یہی بس اُسکے لیئے ہوگا مایۂ نازش — جو اعظم الاُمرا نے قبول فرمایا

قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۸ ہجری

تہنیت ولادت فرزند ارجمند در شبستان اقبال جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

فیضِ ربِ ذو المنن سے۔ مژدہ اے اہلِ دکن — نائبِ دولت کا نخلِ آرزو لایا ثمر

دی بشیرِ دولت و دیں کو وہ چیز اللہ نے — جس سے پایا دیدۂ یعقوبؑ نے نورِ بصر

جسکو پیری کا عصا سمجھا خلیل اللہ نے — حق نے دی جسکے عطا ہونے کی سارا کو خبر

جسکے ملنے سے ہوا داؤدؑ ممنونِ قضا — جسکے پانے سے ہوا ایوبؑ مرہونِ قدر

جسکے بدلہ میں علی الرغمِ شماتت پیشگاں — حق سے ختم الانبیا نے پائے شبیرؑ و شبرؑ

جو بضاعت ہے گدا کی اور دولت شاہ کی — جو ہے حاصل عمر کا اور زندگانی کا ثمر

جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز — جس سے ہیں اجداد زندہ اور آبا جد ناموَر

صدرِ اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خلف — خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر

یہ پسر یارب بحقِ عترتِ خیر الوریٰ — پائے عمرِ خضر زیرِ سایۂ مہرِ پدر

صدرِ اعظم کیطرح دربارِ آصف جاہ میں — جایگاہِ قربِ سلطانی ہو اُس کا مستقر

دولت و ثروت کو اُسکی ذات سے لگجائے شان — زیورِ علم و ادب سے ہو مُحلّی اس قدر

سیرت و عادت میں اُس کی نکلے آن اجداد کی
جوہرِ اخلاق فاروقی[۹] ہوں اُسمیں جلوہ گر

ملکِ آصف جاہ میں سر آسماں جاہ اور وہ
رات دن رکھیں اُجالا صورتِ شمس و قمر

۱۰۔ قصیدہ[۱۰] مرتبہ سنہ ۱۳۰۹ ہجری

اے صفر کی دوسری۔ روزِ دوشنبہ مرحبا
ہم نہ بھولینگے کبھی وہ تیری صبحِ جانفزا

ہمنے رکھا آکے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اک عالم نیا

عزتِ قومی۔ ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے
اُسکے کچھ آثار دیکھے ہمنے یہاں بشکرِ خدا

کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اک مدت سے ہم
آکے بلدہ کے سوانہ میں لگا اُسکا پتا

بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے
جھولیاں ڈالے گلے میں دربدر دیتے صدا

پہنچے لینے اُن کو وہ اعیان دار الملک سے
دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے اتکا

قوم کو ہے جنپہ فخر اور ملک کو ہے جنپہ ناز
سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قوے

صدرِ اعظم (یعنی مدار المہام ۱۲) نے ہمیں بخشا اقامت کے لیئے
وہ سرابستاں خجل ہو جس سے جنت کی فضا

ہم غریبوں کو سمجھکر اک سفارت قوم کی
دی وہ عزت بشکر جسکا ہو نہیں سکتا ادا

پیشتر مہماں نوازی کا فقط سنتے تھے نام
آکے یہاں سمجھے کہ ہے مہماں نوازی چیز کیا

---

۹ اس میں یہ اشارہ ہے کہ نواب سر آسمان جاہ بہادر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں ۱۲

۱۰ یہ قصیدہ ماہ ستمبر ۱۸۹۱ء مطابق صفر ۱۳۰۹ ہجری میں بمقام حیدرآباد دکن جب کہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مع اکثر رفقا کے جن میں سے ایک راقم بھی تھا بطور ڈیپوٹیشن کے محمڈن کالج علی گڈھ کی طرف سے حضور سرکار نظام میں حاضر ہوئے تھے ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا تھا۔ جسکے صدر انجمن جناب نواب وقار الامراء بہادر تھے ۱۲ حالی

کی ہے نواب اقتدار الملک نے جو مرحمت — اُسنے کُلفت کو سفر کے دل سے بالکل دھو دیا

یہ مقولہ ہند میں مدت سے ہے ضرب المثل — جو کہ جا پہنچا دکن میں۔ بس وہیں کا ہو رہا

ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری — جو دکن میں آکے دیتی ہے وطن دل سے بُھلا

وارثِ ملکِ دکن ہے آج وہ محبوبِ خلق — نام پر دیتا ہے جسکے جان ہر چھوٹا بڑا

ہم کہ ہیں وکٹوریا کے عہدِ سلطنت میں پلے — امن و آزادی کی ہمنے کھائی ہے برسوں ہوا

جانتے ہیں ہم کہ پلتی ہے رعیّت کسطرح — کسطرح ہوتے ہیں مقبولِ جہاں فرمانروا

کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیرِ قلوب — کسطرح بوتے ہیں دل میں خلق کے تخمِ وفا

کر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر — تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اُس نے ادا

ہے یہی شاہِ دکن کی گلہ بانی کی دلیل — گلہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا

پوچھنے گچھنے کی اہلِ ملک سے حاجت نہیں — اُن کی خوشحالی پہ اُن کی تازہ روئی ہے گوا

دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار — خلق کو سرسبز دیکھا آکے یہاں اُس سے سوا

راہ میں دیکھے تھے ہمنے کوہ اگر گردوں شکوہ — آکے دار الملک میں دیکھے محل[8] گردوں نما

عاملوں کی سخت گیری سے ہیں سب آزاد یہاں — بینوا سے مُنعم اور مُنعم سے بڑھکر بینوا

اغنیا میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں — جیسا بے پروا نظر آتا ہے یہاں ایک اک گدا

جتنی یہاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول — بے تعصّب بے تکلّف بے تصنّع بے ریا

ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک — ایک کی تقریب میں ہمدم ہیں سب اور ہم نوا

8 یہ اشارہ ہے اُس محل کی طرف جو کہ نواب وقار الامرا بہادر نے بلدہ حیدرآباد کے باہر بجانب جنوب پہاڑ پر زرِ خطیر صرف کر کے اپنے رہنے کے لیے بنوایا ہے اور اُسکا نام فلک نما رکھا ہے ۱۱

دولتِ عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیئے ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یہاں دوسرا

پارسی ہندو مسلماں یا مسیحی کوئی ہو ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ہمکو یہاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ رہگذر کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا

قصہ کوتہ - بار جب ہمکو ملا دربار میں کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا

دیکھکر اپنی رسائی تختِ آصف جاہ تک واقعہ مور اور سلیماں کا ہمیں یاد آگیا

حضرتِ والا نے جس شفقت سے کیں نذریں قبول اسپہ گر جاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہے بجا

جس توجہ سے سنی رودادِ قومی درسگاہ شکر سے اُسکے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برآ

جب سے کالج کی علیگڈھ میں بنا ڈالی گئی دولتِ عالی - مدد کرتی رہی اُس کی سدا

جو لگایا تھا درخت اُس کی ہمیشہ لی خبر دمبدم پانی دیا یہاں تک کہ بارآور ہوا

اب - کہ وقت آکر پڑا تھا بانیِ کالج پہ سخت دولتِ عالی نے شرطِ دستگیری کی ادا

مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اوّل سہل کی اُسی دریا دلی سے اُن کی پھر حاجت روا

خود علی گڈھ کالج اور اُس کے در و دیوار سب راگ گائیں گے سدا احسانِ آصف جاہ کا

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تلک اسلام کی جیتے جی ہوں گی نہ اُسکے طوقِ منت سے رہا

کی ہے سر سیّد نے جو کوشش فلاحِ قوم میں اُس کو ہے اے اہلِ مجلس اک زمانہ جانتا

پر یہ سر سیّد سے بیڑا پار ہونا تھا محال دولتِ عالی اگر بنتی نہ اُس کی ناخدا

تھا پڑا اسٹینڈ کا - سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز دولتِ عالی نے اُس خشکی میں گنگا دی بہا

ہے روایت - جبکہ ہجرت کرکے ختم المرسلیں پہنچے یثرب میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا

"جسطرح ہوتی ہے بانبی سانپ کی جائے پناہ　　ہو گا ملجا اب مدینہ بھی یونہیں اسلام کا"

ہے بلا تشبیہ۔ دارالملک آصفجاہ بھی　　ہند میں اب مرکزِ اسلام ہے روتو رہا

ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستاں میں انتخاب　　دولتِ عالی نے چن چن کر لیا سب کو بلا

تربتیں اور خانقاہیں۔ مدرسے اور مسجدیں　　سب کی ہوتی ہے مدد اس گھر سے بے چون چرا

حجِ بیت اللہ سے۔ جو ہر مسلماں پر ہے فرض　　ہے دکن آنا مقدم۔ شک نہیں اس میں ذرا

اول آنا چاہیئے یہاں استطاعت کے لیئے　　کیونکہ ہے بے استطاعت حج کو جانا۔ نارَوا

خرچ سے ہاتھ اک مسلماں کا ہو گر اتنا میں تنگ　　ہے دکن کی سمت وہ گردن اٹھا کر دیکھتا

خواب آتے ہیں دکن کے اسکو سوتے میں نظر　　قوم کا بچہ مڈل سے جب ذرا آگے بڑھا

ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں　　اور مدد کو جن کی وہاں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا

چلتے چلتے ان کی گاڑی بھی اٹک جاتی ہی جب　　کھینچنے کو اُسکے جاتا ہے یہیں سے بینڈیا

ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یارو وہ مثال　　اک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہے طوفاں بپا

تھا جہاز اک اسمیں معمورِ اہلِ فضل و جاہ سے　　لطمۂ امواج نے پرزے دیئے اسکے اڑا

ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اچھلے نہ پھر　　بچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست و پا

کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں اُن کو نظر　　اُس محیطِ بیکراں میں ایک زورق کے سوا

ہے وہ زورق فی المثل سرکار آصف جاہ کی　　ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جسکا آسرا

ہے دعا۔ جسوقت تک پانی سمندر میں رہے　　یارب اِس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا

8 جب گاڑی یا چھکڑا بیلوں سے نہیں کھچ سکتا تو بیلوں کی جوڑی کے آگے تیسرا بیل لگا دیتے ہیں اسکو بینڈیا کہتے ہیں ۱۲

ختم کر حالی سپاس صدرِ اعظم پر سخن — بال بال اپنا ہے جسکے شکر میں جکڑا ہوا
تقویت سے جس کی ہر مشکل ہماری حل ہوئی — انجمن کے منعقد ہونے کی دی جسنے رضا
پھر ادا کر جان و دل سے شکرِ صدرِ انجمن — جسکے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا
جسنے قومی انجمن میں بن کے صدرِ انجمن — قوم کو دی عزت اور اُنکی اُمیدیں دیں بڑھا
لیکے اذنِ صدرِ مجلس کیجے پھر قصدِ وطن — ورنہ ہے حالی دکن کی دلفریب آب و ہوا
باندھیے جلد اب رختِ سفر۔ ڈر ہی کہ ساتھ — قافلہ سے چھُٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

۱۱۔ قطعہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۹ ہجری [8]

بمقام حیدرآباد دکن

یہاں بولا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے — اول اُسکا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں
خدمتِ والا میں ہیں اک عرض کرنی چاہتے — عرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں
شاعری جسکو سمجھتے ہیں کمالِ ابنائے دہر — جو لیاقت اُسمیں ہے درکار وہ ہم میں نہیں
شکر کرنا تھا ہمیں سرکارِ عالی کا ضرور — چند نظمیں انجمن میں اسلیئے ہمنے پڑھیں
گرچہ کی ہے کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت — اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں

8 سنہ ۱۳۰۹ ہجری میں جو راقم اور مولٰنا محمد شبلی نعمانی اور دیگر بزرگانِ قوم آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر کے ہمراہ علیگڈھ محمڈن کالج کی طرف سے بطور ڈیپوٹیشن کے حیدرآباد دکن میں بحضور سرکار عالی نظام حاضر ہوئے تھے اُس موقع پر ایک عام جلسہ بصدارت نواب وقار الامرا بہادر بشیر باغ میں منعقد ہوا تھا جسمیں راقم نے اور مولٰنا محمد شبلی اور بعض اور صاحبوں نے کچھ نظمیں سرکار عالی کے شکریہ میں پڑھی تھیں جلسہ کے بعد جناب صدر انجمن نے مجھکو اور مولٰنا محمد شبلی کو خاص طور پر ہماری نظمیں دوبارہ سننے کے لیئے دولتخانہ پر طلب فرمایا تھا وہاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اُسیوقت موزوں کیا گیا تھا راقم نے پڑھا تھا۔

رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اک قصور
درگذر فرمائینگے سرکار اُس سے۔ ہے یقیں

اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں اِن میں۔ مگر
جھوٹ۔ جو اشعار کا زیور ہے وہ اِنمیں نہیں

۱۲۔ قطعہ مرتبہ ۱۳۰۹ھ ہجری بمقام حیدر آباد

در شکر اضافہ وظیفہ بہ پیشگاہ جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر

اے بشیرِ دولت و دیں۔ نائبِ شاہِ دکن
اے مہمات دکن کا ذات پر تیری مدار

مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اُسکا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار

جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے
پہلے ہو لیتے ہیں صدہا مشکلوں سے وہ دوچار

کوئی دنیا میں نہیں ہوتی بغیر اسکے فتوح
ہے اسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار

پر۔ ملا مقصود جب حالی کو اس در سے ملا
بے تردد۔ بے تذلل۔ بے طلب۔ بے انتظار

قدردانی گر زمانہ میں یونہیں ہو جائے عام
پائیں بے مانگے مرادیں اپنی سب اُمیدوار

یارب اس سرکار کو۔ ہے جس سے عالم فیضیاب
جب تلک دنیا رہے دنیا میں رکھیو برقرار

۱۳۔ ترکیب بند مرتبہ ۱۸۹۱ عیسوی مطابق ۱۳۰۹ھ ہجری

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا

شکر اس نعمت کا یارب کر سکے کیونکر زباں
تو نے رکھا ہمکو یہاں فقر و غنا کے درمیاں

اس نظم میں متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلف ہاپ سے دولت عزت نیکنامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کر کے اپنے ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا ہو ادنے درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں بڑھ سکتے۔ اعلےٰ درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت و عزت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوتے مگر اس حالت سے ترقی کرنیکی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اس حالت پر قایم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنیکا کچھ۔

جب ہوئے بھوکے تو بخشی تو نے نان و نانخورش — پر نہ اتنی۔ ہو مرحم و احشا پہ جو گزرے گراں
جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک — پر نہ ایسا۔ ہو صراحی جس کی یاروں سے نہاں
ڈھانکنا چاہا بدن جب۔ تو دیا تو نے لباس — پر نہ ایسا۔ جس کو حسرت سے تکیں خرد و کلاں
کھانے پینے کو کیئے برتن ہمیں تو نے عطا — پر نہ ایسے۔ ٹوٹنے سے جنکے ہو خوف زیاں
سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں — پر نہ ایسا۔ جس سے اُٹھنا ہو طبیعت پر گراں
رہنے سہنے کو دیئے گھر تو نے ہمکو ہر جگہ — پر نہ ایسے۔ ہو تعلق جنسے مثلِ جسم و جاں
آنے جانے کو دیئے دو پانو بھاں تو نے ہمیں — جنسے ڈر لے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں
راہ اور بے راہ یکساں جنکو ہنگامِ خرام — کوہ سدِ راہ جنکا اور نہ خندق اور کُواں
کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر — پر نہ ایسی۔ تختِ فرعونی کا ہو جسپر گماں
سیم و زر وقتِ ضرورت ہمکو تو دیتا رہا — پر نہ اتنا۔ ہو نگھبانی میں جسکی بیم جاں
آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز — پر نہ ایسی۔ جس سے ہوں محسودِ ابنائے زماں
نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں — تاکہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہمپر عیاں
راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد — تاکہ کھو بیٹھیں نہ ہم اُن راحتوں کو رائگاں

وقت پر کرتا رہا باران رحمت سے نہال
قحط اور طوفان دونو سے بچایا بال بال

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر — لومڑی جاتے ہیں بن جسکی بدولت شیر نر
چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیہ — ناکسوں کے ناز بیجا سہتے ہیں اہلِ ہنر

وزن میں علم و فضیلت جن کے ہے ہم سنگ کوہ — وہ سبک تر دانۂ خردل سے آتے ہیں نظر
فقر و حاجت میں نہو انساں کو جب صبر و شکیب — پھر نہیں کوئی برائی فقر و حاجت سے بتر
بھیک منگوائے جُوا کھلوائے یہ چوری کرائے — پت گنوائے آبرو کھوئے پھرائے دربدر
ہو سکے محتاج سے طاعت نہ یاد اللہ کی — لے سکے محتاج جورو کی نہ بچوں کی خبر
گہ زباں آلودہ اُس کی شکوۂ تقدیر سے — اور کبھی بوچھاڑ اُس کی آسمان پیر پر
گہ بخیلوں کی مذمت پر کبھی آجائے وہ — ہو نہ سبّ و شتم سے سیری اُسے دو دو پہر
اُگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ — کھول دے غیبت کا دفتر اہلِ دولت کی اگر
گہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے — تا کہ دولتمند بھی کچھ دن رہیں آسیمہ سر
اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب — تا کہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر
بے حلاوت اُسکی دنیا اور مذبذب اُسکا دیں — خوفناک اُسکا ارادہ نیّت اُس کی پر خطر
رات اُسکی حسرت آگیں اور دن اندوہگیں — شام اُس کی پر نحوست اور شوم اُسکی سحر
گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا — تھا۔ مگر ثروت میں اُس سے بھی سوا شور و شر

فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت سوا اسکے شکر کی طاقت نہیں

نشۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں آنا محال — اِس مئے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال
نفسِ امّارہ اور اُسپر چھیڑ مال و جاہ کی — ڈھیر ہے بارود کا دیجے پتنگا جسمیں ڈال
بادِ صرصر آگ کو اسطرح بھڑکاتی نہیں — جسطرح جذباتِ نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال

ہضم کرنا اور پچانا مال و دولت کا ہے بس — نفس انساں میں اگر بالفرض ہو کوئی کمال

ورنہ مال و جاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم — اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال

عقل ٹھیراتی ہے جو افعال انساں پر حرام — کر دیئے اُسکے لیئے سب مال و دولت نے حلال

فقر میں تھا نفس دوں واماندہ جس پرواز سے — آگئے ثروت نے دینے پر واسطے اُسکے نکال

خواہشیں یوں نفس میں اب دمبدم بڑھنے لگیں — مغز میں جسطرح دیوانہ کے گوناگوں خیال

آپ کو گننے لگا بالاتر از ابنائے جنس — چیونٹوں میں ایک نے گویا نکالے پر و بال

مُسرف بے زر ہو جیسے قرضخواہوں میں گھرا — خواہشوں میں اسطرح جکڑا ہوا ہے بال بال

جھک پڑی طبع دنی گر بخل و خسّت کی طرف — ہوگئی فرزند و زن پر زندگی اُس کی وبال

اور اگر بھوت اُسکے سر پر چڑھ گیا اسراف کا — پھر نہیں گنجینہ قاروں کچھ آگے اُسکے مال

آگیا غالب طبیعت پر گر استسقائے حرص — ہے سمندر سے بھی اُس کی پیاس کا بجھنا محال

باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اسقدر — جسقدر ثروت میں ہے دشوار پاس اعتدال

گلشن دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر
دیکھ اے روباہ نفس دوں حذر اُنسے حذر

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی — فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنہ سے بری

چین ہے دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہے — یہ جو ہے برزخ میان مکنت و دست تہی

فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ اور جنت اگر — مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی

دخل شیطاں کا ہو جسمیں ایسی جنت کو سلام — منزل اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

اِس کٹھن منزل میں ہے بنیا یہی اک بے خطر ۔۔۔ ہیں اِدھر کھڈ اور چڑھائی ہے اُدھر البرز کی
رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بَین بَین ۔۔۔ ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مُہلک سے بری
اپنے سے اعلیٰ کی حالت پر اگر آتا ہے رشک ۔۔۔ دیکھکر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دل دہی
سُنکے ہو جاتے ہیں سیدھے وہ بڑوں کا فخر و ناز ۔۔۔ ملکے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر خنّا کبھی
لذّتِ فقر و غنا دونو سے ہیں وہ آشنا ۔۔۔ اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی
جو گذرتی ہے گدا پر اُس سے ہیں وہ باخبر ۔۔۔ کیونکہ حالت گاہ گاہ اُنپر بھی گذری ہے یہی
امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوے ۔۔۔ کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی
اِس لیے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابنائے جنس ۔۔۔ جوشِ ہمدردی سے بیکل اُن کا ہو جاتا ہے جی
اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا ۔۔۔ جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی ازخود رفتگی
مست کی سب بے اختیاری تشنگی مخمور کی ۔۔۔ واردات ایک ایک کی ہے سب پر اُنپر کھلی

جنّت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر
گندم اور زقّوم دونو اُنکے ہیں پیشِ نظر

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت انسے ہے ۔۔۔ منتظم ہر قوم و ملّت کی جماعت انسے ہے
مشکلیں اکثر انھیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل ۔۔۔ بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت انسے ہے
ہے انھیں کے دم سے جو ہے گرمیِ ہنگامہ آج ۔۔۔ ساری قومی مجلسوں کی زیب و زینت انسے ہے
ہے جہاں دولت یہی ہیں نظمِ دولت کے کفیل ۔۔۔ ملک کی دولت میں ہے جو خیر و برکت انسے ہے
ہاتھ میں انکے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام ۔۔۔ عقل و دانش میں ہے جن ملکوں کی شہرت انسے ہے

ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر　　شاہ ہوں یا ہوں گدا دونو کو قوت انسے ہے
آدمیت سیکھتے ہیں انسے سب چھوٹے بڑے　　نوعِ انساں ہیں بقاے آدمیت انسے ہے
یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یہاں　　رونق بازار جنس علم و حکمت انسے ہے
پاؤگے انہیں طبیب انہیں ادیب انہیں خطیب　　ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت انسے ہے
پاؤگے ان میں مہندس پاؤگے انہیں حکیم　　آدمی مصداق رحمانی خلافت انسے ہے
کرتے ہیں اخلاق ادنیٰ اور اعلیٰ انسے اخذ　　آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت انسے ہے
ان میں قوموں کے ہیں مصلح انہیں ملکوں کے کفیل　　آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت انسے ہے
پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں　　ہے جہاں قوموں میں یکرنگی و وحدت انسے ہے

دم سے ہے وابستہ انکے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

گر نہ ہو ہر حال میں ان کی مصالح پر نظر　　ہیں مفاسد گرد و پیش انکے فراہم سربسر
کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں　　ہے انھیں بھی شر سے یہاں بچ بچ کے ہنا عمر بھر
گھاٹیاں فقر و غنا کی انکے ہیں دونو طرف　　اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر
ایک جانب پستی فطرت ہے اور دوں ہمتی　　ایک جانب مستی و غفلت ہے اور کبر و بطر
جھک پڑے گر اسطرف تو مفت کھو بیٹھے انھیں　　وہ جو اڑنے کے لیے حق نے دیے تھے بال و پر
ڈھل گئے گر اسطرف تو اس بلا میں پھنس گئے　　جسمیں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر
برکتیں اللہ کی اس قوم پر جس قوم میں　　رہ سپر پہ طبقہ والا ہو سیدھی راہ پر

ہیں معطّل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست — سب کی پڑتی ہے انھیں کے دست و بازو پر نظر
جو قُویٰ ان کو ملے ہیں کام میں لائیں اُنھیں — تاکہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی بسر
فرض ہیں جو انکے ذمّہ خالق اور مخلوق کے — اُن میں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آٹھوں پہر
قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اُسے — کیونکہ اُسکے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر
گو نجات انساں کو مکروہاتِ دنیا سے نہیں — جیسے بچنا گوشت سے ناخن چھُٹانا ہے مگر
کام دنیا میں سنوارے ہیں جنھوں نے قوم کے — تھے نکمّوں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر
سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے کام — اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر

جسطرح اس انجمن کے رُکن آئے ہیں تمام
قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑکر دنیا کے کام

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی — جس سے جان آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
اتفاق قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل — رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی
مال و دولت نامبارک ہے نہو گر اتفاق — قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی
یہاں وکیل ایک اک ہی شہر اور ملک کا قایم مقام — دانہ کو کرتی ہے جو خرمن وہ برکت ہے یہی
رائگاں جائے گا یاروں کا نہ یہ رنجِ سفر — راحتیں جسکی طفیلی ہیں وہ زحمت ہے یہی
فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں ہوکے مجتمع — ملتے ہیں جس کی بدولت دل وہ ملّت ہے یہی
تم ہمارے کام آؤ ہم تمھارے آئیں کام — جس سے کُل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی
قوم کی خدمت میں ہے مُضمر ربوبیّت کی شاں — جو کہ پجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

قوم کی ذلت کو سمجھیں ذلت اپنی سب عزیز ملک میں عزت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی
سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی
کر رہا ہے قوم کے سر کل کو یہ مجمع وسیع جزر سے افزوں ہے مد جسکا وہ رجعت ہی یہی
اتفاقاً گر کبھی ہوجائے یہ ہنگامہ سرد ڈر نہیں اسکا کہ خود قانون قدرت ہے یہی
ہے کبھی افراط باراں اور کبھی ہے قحط آب طینت عالم میں خاصیت ودیعت ہے یہی
کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلت ہی یہی
دیگ تو پکتے ہی یہ پکنے کی دھیمی آنچ میں کچھ اُبال آیا تو ہے اُسمیں غنیمت ہے یہی

انجمن ہے قوم کی ہنگامہ شادی نہیں
ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

۱۴ مسدس مرتبہ سنہ ۱۳۱۰ ہجری

مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی

اے جہان آباد۔ اے اسلام کے دار العلوم اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے۔ جتنے گردوں پر نجوم تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھکو جہاں آباد کا
نام روشن تجھسے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم دیں جیسے اُمّی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں جو تھا مُحدِّث تھا وہ تیرا خوشہ چیں
تھی محدّث خیز اے پایتخت تیری سرزمیں

تھا القفّہ بھی مسلّم تیری خاکِ پاک کا
بیہقی وقت تھا ایک اک فقیہ اِس خاک کا

شاذ و نادر تھا تصوّف میں کوئی تیرا نظیر
آب و گِل کا تیرے تھا گویا تصوّف سے خمیر

تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مُہرِ منیر
تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مُستنیر

آج جس دولت کا بازارِ جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اُس دولت سے مالا مال ہے

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اُسنے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم

جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبّا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طبِ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یہاں تجھسے ارزانی ہوئی

خاک سے اُٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ وَر
اک جہاں شیوا بیانی سے ہے اُن کی باخبر

راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اسقدر تنی ہوائے غاتفر[8]

حُسنِ صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد[+] تھا
حُسنِ معنی تیرا حصّہ اے جہاں آباد تھا

لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جنمیں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم

8 غاتفر سمرقند کے قریب ایک قطعۂ زمین ہے جہاں کا سرو خوبی زیبائی در استی میں ضرب المثل ہے ۱۲ + نوشاد اور خُتن دو شہر قدیم ترکستان میں تھے جو حسن خیزی میں ...

دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم — کھیتیوں پر تیری ابر آتے تھے اُٹھ کے جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں

تیری سرحد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام — تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہورِ انام

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام — شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں

طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال — ڈھل گئے سانچے میں گویا اُس کے عادات و خصال

آ کے بن جاتا تھا یہاں نقصان انساں کا کمال — تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال

آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یہاں

چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یہاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب — آن کر لیتے تھے یہاں ٹھیکی جہاں کے انتخاب

بستے تھے اطراف سے آ آ کے تجھ میں شیخ و شاب — کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جمگھٹا تھا تجھ میں تُرک و فُرس و رُوم و زنگ کا

دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبع دوراں کا ہے جیسے اقتضا — ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا

تیری جا کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا — وقت اسے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا

گردش افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار
تجھ پہ اے دار الخلافت انقلاب آنے لگے غیب سے تجھکو تباہی کے خطاب آنے لگے
طالعِ شفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رخت سفر
تجھ سے اے دار العلوم اُٹھنے لگا علم و ہنر
ہو گئے تیرے مُحدِّث راہیِ دار السلام کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام
مجلسیں برہم ہوئیں پیروز بردیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے
چل دیتے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب اس گلستاں سے نہ اُٹھی پھر صدائے عندلیب
جنکو کھو بیٹھے نظیر اُن کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اُسکا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر
گر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سفر گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
جھڑ گئے تاج شرف سے تیرے سب لعل و گہر تجھ کو اے دار الخلافت کھا گئی کس کی نظر
علم ہے باقی نہ اب دولت ہی تیرے پاس وہ

اے گل پژمردہ تیری کیا ہوئی بو باس وہ

دور آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یہاں تیری پھر اُگلے وہ لعل بے بہا جنسے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہد ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی پر نہ کی عرض ہنر میں تو نے اب بھی کو تہی
اس بزرگی سے گذاری تیرھویں تو نے صدی پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دورِ اکبری

علم دین و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں دھوم

ملک میں ہر سو ہی پھر بول بالا تھا ترا تھا جہاں علم و ہنر گو دن کا پالا تھا ترا
تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اُجالا تھا ترا پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا

چاند نکلا تھا گہن سے جو وہ پھر گہنا گیا
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیئے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اُسکو بھی اے دلّی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو لے شہر عظمت قوم کی ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

تجھ میں ہے دلی! کوئی اب ایسا مقبول جہاں نازش دار الخلافت مرجع ہندوستاں
ہند سے لے تا عرب کشمیر سے تا اندماں بچہ بچہ کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں؟ واقعات زندگی کر دیجے گر اس کے بیاں
سمجھیں اک افسانہ ناواقف اسے اور داستاں ہے تعجب خیز الحق سیرت محمود خاں

یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہر انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دار الشفا خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اسکے در سے ملتی تھی دوا فکر نذرانہ کا تھا ان کو نہ شکرانہ کا تھا

اسکے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کھل مزدور کا

بے حقیقت اسنے سمجھا مال و دولت کو سدا تھے برابر اسکے نزدیک اغنیا اور بے نوا

گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا کوئی مفلس کا نہ تھا پرسان حال اُسکے سوا

کرتے ہیں جو دعویٔ ہمدردیٔ نوع بشر
اُسنے باطل کردیئے تھے اُنکے دعوے سر بسر

طب مسلمانوں کی لی اُسکی مسیحائی نے تھام ورنہ اب تک اُسکی ترکی ہوچکی ہوتی تمام

رونقِ طبِ جدید اور سپہ سپیل خاص و عام درسگاہوں اور دواخانوں کا اُسکے انتظام

دیکھ کر تھا اک زمانہ اُس کی خوبی کا مُقِر
طِبِ یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

سرجنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمالِ جمیل آگیا تھا راسے میں زود اعتقادوں کی خلل

دیں مگر اُس کی مسیحائی نے سب رائیں بدل طبِ یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل

سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اُسکے حملوں سے ہوئی عُہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب پر اُلجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب

خلق کا پھر ملجأ و ماوٰے اُسیکا تھا مطب اُسکے بیماروں کو گو مایوس ہوں یا جاں بلب

سوء تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مُہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جسقدر کرتے ہیں معلوم جو جو اُنسے امراض بشر

وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھکے اُنگلی نبض پر اُسکی اک اُنگلی پہ تھے قربان سو تھرمامیٹر

نارسا تھیں دوربینیں اہلِ صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہِ دوربیں اُس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن پیر و جواں، خُرد و کلاں　　تھے قوی پشت اُس سے ایسے جیسے پشتہ سے مکاں
جسکو نسخہ دیدیا لکھکر وہ یہ سمجھا کہ ہاں　　زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یہاں

گو کہ ماتم ملک میں ہے اُسکا ہر سو آج کل
پر گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب اور چارہ گر　　جو کہ تشخیصِ مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر
خلق کو تکیہ ہو جن کی راے اور تدبیر پر　　شہر میں ہوں مرجعِ کل، ملک میں ہوں نامور

جمع ہوں محمود خاں کے ذات میں اُنکی کمال
ہے یہ سب ممکن، مگر محمود خاں ملنا محال

راستی اور راستبازی اُس کی تھی ضرب المثل　　اُسکے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل
امتحاں کے وقت جب تھا نظمِ عالم میں خلل　　راستبازوں کی گئی تھی ٹھیک جب ہر سو نکل

کھوٹ سے اُس آنچ میں نکلا وہ خالص اسطرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کُندن جسطرح

وہ زمانہ جبکہ تھا دلّی میں اک محشر بپا　　نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غُل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا　　باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موج زن تھا جبکہ دریاے عتابِ ذو الجلال

باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھکر یاروں کو جب آنکھیں چُرا جاتے تھے یار　　ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار

یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار　　شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر

جل نہ جائیں اُسکے شعلے سے کہیں خشک و تر

ہو رہا تھا جبکہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں　　کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پُتلا عیاں

ایک جانب تھی اگر خندق تو اک جانب کنواں　　بال سے باریک تر تھی راہ اُن کے درمیاں

راہرو و گمرہ میں تھے اور راہ پر خوف و خطر

اُسنے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ　　عادل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ

مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ　　پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اُسنے کی

اہل انصاف اُسکو بھولے ہیں نہ بھولینگے کبھی

بالیقیں جن ملزموں کو اُسنے سمجھا بے خطا　　مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا

چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا　　جو کہ تھے نادار کی اُن کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا

بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی خو جسکی نہ تھی   دی گواہی جسنے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی
جسنے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی   ہاتھ سے جسنے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی
بیگناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پانو ایک اُسکا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

جبکہ عنقا تھی دیانت بینَ ابناء الزماں   تھی امانت جسکی اُسکے پاس ہلکی یا گراں
خوف میں پاس اپنے رکھا اُسکو مثل پاسباں   کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں
ایک عالم ناخدا ترسی میں جب بیباک تھا
اُسکا دامن تھا کہ ہر دھبّے سے بالکل پاک تھا

وضعداری میں نہ تھا اُسکا زمانہ میں بدل   وضع میں اُسکی تغیر تھا نہ عادت میں خلل
وقت کی تاثیر کا اُسپر نہ چلتا تھا عمل   انقلابِ دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل
اُسکے آگے اِن نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اُس پہ چلتی کچھ زمانہ کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرزِ زندگانی اختیار   اُسمیں فرق آیا نہ وقتِ واپسیں تک زینہار
کوہ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار   وضع اُسکی جو کہ تھی وضعِ سلف کی یادگار
قوم کے انبیا درفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہد عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دنیا کے علایق کا تھا گو بارِ گراں   پر ہر اک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں

پا بگل دنیا میں پر دنیا کے غم سے برکراں   رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شاد ماں

ظاہراً پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا

دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اہل اللہ کا

منقبض اُسکو نہ مکروہات میں پایا کبھی   غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی

دل کسی بادِ مخالف سے نہ کُملایا کبھی   تلخیِ دوراں سے چتون پر نہ میل آیا کبھی

کی بسر دار المحن میں بزم عشرت کی طرح

عمر کاٹی دوزخِ دنیا میں جنت کی طرح

مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار   قوم میں جس کی مثال آئندہ کم دیکھیں گے یار

گل کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادِ بہار   رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار

کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظر انجام پر

قوم میں اک ہمکو سناٹا سا آتا ہے نظر

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار   اہل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار

ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہوں گے کشت زار   جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار

مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یہاں

سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یہاں

پایہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبتِ قحط الرجال   ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال

دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اسکی مثال   ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بےمثال

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی — تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی
داستان کوئی بیاں کرتا تھا حُسن و عشق کی — اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم — راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سَم — کوئی یہاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

۱۵۔ ترجیع بند مرتبہ ۱۸۹۲ء مطابق ۱۳۱۰ھ

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا

یہ خاک ۔ آج جس پر ہیں جمع اہل آرا — یہاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گذر چکی ہیں — آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا
کل جشن فتح تھا یہاں ہو آج جشن شادی — ہر دم عروج پر ہو اسلام کا ستارا
بلبن سکندر آج مہماں خاقاں ہیں اور سلاطیں — اصطخر ہے کہ دِلّی بلبن ہے یا کہ دارا

فیروز شہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آمد آمد | دولھا بنا ہوا ہے تزئیں سے شہر سارا
تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل | بہر مدافعت ہے میدان میں صف آرا
مغلوں کے اُڑ رہے ہیں گل جشن فتح و نصرت | تیمور سے زمانہ ہے برسرِ مدارا
آتا ہے آج بابر لودی پہ فتح پاکر | ہیں شوقِ شاہِ نو میں پیر و جواں خود آرا
گل سوریوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے | مغلوں کا آرہا ہے گردش میں کچھ ستارا
ہے جشن فتح پھر آج چغتائیوں میں برپا | اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قول ہارا
جس دھوم سے ہے گھر گھر جشنِ جلوسِ اکبر | ہے گرد اُسکے آگے جشنِ قباد و دارا
شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا | تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارہ
طیاری اس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے | گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدہ* دوبارا
اطرافِ ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے | پا کر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا
ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر | بالائے تختِ طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن اُنکے اب تک سب زیبِ داستاں ہیں

اے خاکِ پاکِ دہلی اے تختگاہِ شاہاں | پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں
ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہو | پر کوئی جشن قومی آتا نہیں نظر یہاں
تقریب جشن جسمیں ہو کچھ نہ جز اخوت | ملکوں سے جمع آکر جسمیں ہوئے ہوں اخواں
پائین و صدر کا ہو جسمیں نہ کچھ تفاوت | خرد و بزرگ کی ہو جسمیں نشست یکساں

* سدہ آگ کو کہتے ہیں جشن سدہ وہ جشن ہے جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے اول جمشید نے پتھر میں سے آگ جلنے کی خوشی میں بڑی دھوم سے ایران میں کیا تھا ۱۲

جن کو نہ ہو بُلاوا حاکم کا اور نہ قدغن ۔ لایا ہو کھینچکر دل اُنکو نہ حکم سلطاں
خادم ہوں جسقدر وھاں مخدوم قوم کے ہوں ۔ مخدوم جتنے ہوں وھاں سب قوم پر ہوں قرباں
خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ وھاں تواضع ۔ ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں
ٹھیرائیں جسکو چاہیں وہ آپ میر مجلس ۔ چاہیں جنھیں بنائیں وہ آپ میر ساماں
آئے ہوں اسغرض سے سب ملکے تاکہ سوچیں ۔ دنیا میں کسطرح ہوں سرسبز پھر مسلماں
ہندوستاں میں کیونکر باقی رہے نشانی ۔ اُسقوم کی کہ تھا کل جنکے وہ زیر فرماں
نکلیں تو کیونکہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے ۔ اعزاز نے تھا باندھا جنکے بڑوں سے پیماں
اُن مدرسوں کا کیونکر جاری رہے افاضہ ۔ جنکے سبب سے زندہ نام حدیث و قرآں
جو مسجدیں ہیں بہر ذکر خدائے واحد ۔ محفوظ حادثوں سے کیونکر ہوں اُنکے ارکاں
جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر کر ۔ اپنی طرف سے لیکن ہو سعی فرض انساں
ای شہ نشین اسلام ای معدن سلاطیں ۔ ای پایۂ تخت سادات ای دار ملک خاقاں

تو جشن گاہ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے؟

شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے ۔ شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے
دولت کے تھے وہ جلوے ملت کا ہے یہ نقشہ ۔ کاغذ کی تھیں وہ ناویں بیڑا یہ نوح کا ہے
بے روح تھے وہ قالب اسمیں ہے روح بخشی ۔ موج سراب تھے وہ یہ چشمۂ بقا ہے
میلے نہ وہ بچھڑتے روح انکی گر یہ ہوتی ۔ رہتا ہے آندھیوں میں روشن یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر — اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے

بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا — یہ چھت نہ سمجھو سر پر یہ سایۂ ہما ہے

گم گشتہ بخت جسکو پھرتے ہیں ڈھونڈھتے ہم — لگتا ہے کچھ تو اُس کا لگتا یہیں پتا ہے

وہ مشکلیں کرینگے اب حل ہمیں سمجھیں کچھ — جن مشکلوں کا ہمکو اور تمکو سامنا ہے

ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے — معذور ہیں وہ اُنسے شکوہ نہ کچھ گلا ہے

فوجِ کمک کو اکثر سمجھا ہے فوجِ دشمن — حملہ کمک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے

نادم ہوتے ہیں لیکن روشن ہوا جب دن — انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے

قدر اپنی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہمکو — ابتک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہے جان پر جب — لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بیخبر ہیں — پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفات بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب

ہنستے ہیں ناخدا پر روتا ہے ناخدا جب

گلشن میں فصلِ گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں — پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں — اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی — بیفکر و بیخبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں

اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں — رستہ کدھر ہے انکا اور جا رہے کہاں ہیں

فضل و کمال اُنکے کچھ تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

تم سے تھے تو تھا مو عزت کو قوم کی کچھ
اپنے تو قافلے سب پا در رکاب یہاں ہیں

اک خضر رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں

خدمت میں انکی حالی کہتا ہے یہ ادب سے
اسوقت رونق افزا یہاں جتنے مہرباں ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یہاں آثار سب عیاں ہیں

عرصہ ہوا کہ ہمکو آنکھیں دکھا رہے ہیں
قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

گھڑیال اور مگر مچھ ہیں انکو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

سنبھلو وگرنہ رہنا یہاں اسطرح پڑیگا
بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روز بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں جو رہ گئے مٹ نہ جائیں

اشعار متفرقہ

اِنمیں اکثر وہ اشعار ہیں جو لوگوں کی فرمایش سے خاص خاص موقعوں پر اُردو یا فارسی وغیرہ میں لکھے گئے ہیں

تمہید رقعہ شادیِ عروسی

شکر کیجے کونسی نعمت کا خالق کی ادا — ایک سے ہے ایک نعمت اُس کی بندوں پر سوا

اُس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی — جس نے جو مانگا وہی اُسنے مہیا کردیا

نخلِ تر کو پھل دیا اور پھل کو بخشا رنگ و بو — سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب اور ضیا

کھیتیوں کو مینہ دیا ماں باپ کو اولاد دی — اُس سے دی دنیا کو رونق اِس سے آنکھوں کو جلا

عمرِ روز افزوں عطا فرمائی پھر اولاد کو — کل چھٹی تھی جن کی ہے دن آج اُنکے بیاہ کا

آوٴ اُسکے شکر میں سب مِلکے باہم شاد ہوں — تاکہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعامِ خدا

ایضاً

چھٹی بیاہ یا تیج تہوار ہو — لب آب یا صحن گلزار ہو

گل و لالہ ہو یا ہو عطر و گلاب — مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب

یہ سارے خوشی کے ہیں ساماں جب — کہ ہوں ایک جا جمع احباب سب

بزرگوں سے محفل کی شوکت بڑھے — عزیز اور پیاروں سے عزت بڑھے

جہاں اس طرح جمع ہوں چار یار ہیں اس بزم پر لاکھ گلشن نثار

ایضاً

شکر کہ از فضل خدائے جہاں وقت خوش از پردہ برآمد عیاں

شادیِ دل را سبب آمد بدست فرصت بزم طرب آمد بدست

تا شود از مقدم اہل کرم کلبۂ ما غیرت باغِ ارم

ایضاً

رفت آسیب زمستاں باز نوروزی وزید دوستداراں را بشارت باد و یاراں را نوید

طرحِ بزم خرمی با ہمدگر باید نہاد نغمۂ شکرِ الٰہی دمبدم باید کشید

ایضاً

سلامٌ من محبٍ مستکینٍ یلیہ الخیر والبرکات تتریٰ

سلامٌ ردفہٗ روحٌ وراحٌ وبین یدیہ للاحباب بشریٰ

ودعوۃُ شاھدین وغائبینا من الاخوانِ والخلانِ طُرّا

خاتمہ رقعہ شادی

فاطیبُ العیشِ فی الدنیا وارغدہٗ رھینۃٌ بزیاراتِ الاحباءِ

ایضاً

ہزار دیدہ و دل فرش راہِ یارانے کہ از مسرتِ یاراں مسرت اندوزند

بہ شادی و طرب ہمدگر شوند انبار ہزار رخ ز فروغ دلے برافروزند

ایضاً

کار احباب ساختن بتواں دوستاں را نواختن بتواں
تا بہ دہر ابر و باد خواہد ماند از شما لطف یاد خواہد ماند

اشعار غزل ناتمام

اس زندگی کے ہاتھوں چین ایک دن نہ پایا یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں
حاضر ہو جب نہ دل ہی ہے باغ و راغ یکساں ہم دوستو گئے بھی ۔ تو کیا گئے چمن میں
ہے اک خراش دل میں ۔ ڈر ہے کہ بھر نہ آئے زخمی ہے قیرواں میں اور مشک ہے ختن میں
تو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوتی ہے ورنہ اے فاختہ دھرا ہے کیا سرو و نارون میں

ایضاً

کسقدر یارو ہوا ہے انقلاب آگیا یاروں کے اقراروں میں فرق
خود بتا دے گا تمھیں دورِ زماں بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق
ان پہ ہم قرباں ہیں وہ ہم پر نثار ہے بہت پیاروں میں اور یاروں میں فرق

ایضاً

گر نہ ہو نیّتِ گدا میں فرق آتے کیوں شاہ کی عطا میں فرق
ہیں وفادار اور بھی لیکن ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

اشعار قصیدۂ ناتمام

یادِ ایام کہ تھی باغ جوانی پہ بہار نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار

نشہ میں چور تھے اک بادۂ پرزور کے ہم — جسکا رحمت میں نہ کلفت میں اُترتا تھا خمار
سر پہ وہ دیو قوی آکے چڑھا تھا اپنے — یاد تھا جسکا نہ عامل کو نہ سیانے کو اُتار
روکتا تھا نہ جسے غار نہ خندق نہ کنواں — تھے ہم اُس توسنِ سرزور پہ دن رات سوار
رہتے تھے اُس شترِ مست کی صورت بے قید — ہاتھ سے جسنے شتربان کے تڑالی تھی مہار
پندگو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دلسوز — اُن کی صحبت سے تھے اُتنے ہی زیادہ بیزار
خیرخواہ اور تھے غمخوار و مربی جتنے — انکی صورت سے ہمیشہ ہمیں چڑھتا تھا بخار
ملکے ہمجولیوں سے جان میں جان آتی تھی — ہنسنے اور بولنے پر زیست کا تھا اپنی مدار
اب اُمنگیں ہیں وہ دلمیں نہ ترنگیں باقی — تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں لیل و نہار

صدائے گدایانِ قوم [8]

ڈھونڈھنے خضرِ مبارک پے کو یہاں آئے ہیں ہم — چھوڑ کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم
ڈرتے ہیں جو خوشدل ہیں وہ سنکر نہوں پژمردہ دل — سخت عبرت خیز لیکر داستاں آئے ہیں ہم
ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن — لیکے اُسکا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم
علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے — آج اس در پر اُسیکے نوحہ خواں آئے ہیں ہم
قوم کھو بیٹھی ہے جو عباسیوں کی یادگار — جستجو میں اُسکی مشعل لیکے یہاں آئے ہیں ہم
تاکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا — اسلئے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم

8 پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے چند باہمت لوگوں نے جنھوں نے اپنی جماعت کا نام گدایانِ قوم رکھا تھا ریاست بہاولپور میں چندہ وصول کرنیکے لیئے جانیکا ارادہ کیا تھا۔ اُنکا قصد رئیس کے حضور میں یہ اشعار پڑھنے کا تھا لیکن غالباً اُنکا جانا نہیں ہوا۔ چونکہ رئیس بہاولپور بنی عباس میں سے ہیں اور عباسیوں کی خلافت میں علم کو بہت ترقی ہوئی تھی اسلیئے یہ مضمون اسطرح ادا کیا گیا ۱۲

خود غرض ٹھیرائیں یا مکّار ہمکو یا گدا — ذلتیں یہ کرکے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم
فخر سب بیجا ہیں اُنکے قوم ہے جنکی ذلیل — فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم
ہیں بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل — اسلیئے یہاں بن بُلائے میہماں آئے ہیں ہم
تشنگی اپنی بجھانی ہوگی اے آبِ حیات — لیکے مونہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

مژدہ قدوم حضور شاہزادہ ویلز در ہند

مژدہ ہو اہلِ مشرق اب دن پھرے تمھارے — مغرب سے سوے مشرق آیا ہے مہر تاباں
گلہ کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے — ہے ایسے گلہ باں پر گلہ کی جان قرباں
ہندوستاں بھی تجھ سے کچھ آجکل نہیں کم — اے معدنِ بزرگی اے خاک انگلستاں
تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن — ہندی بھی ان دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں
مہماں ہے آج اُن کا اُس شاہ کا ولی عہد — روئے زمیں کے سلطاں جسکے ہوئے ہیں مہماں

[8] شکریہ عطائے مدرسہ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع اجمیری دروازہ دہلی بحضور جیمس لائل لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب از طرف طلبائے انگلو عربی سکول دہلی

آتے ہیں لے دلی کے دل آرا — شہر دعا گو سب ہی تمھارا
شکر کا ہم گو کہہ نہیں یارا — پر یہ ہے کہنا فرض ہمارا

[8] یہ نظم چونکہ خورد سن طالب علموں کے لیئے لکھی گئی تھی تاکہ وہ ہز ہائنس کے روبرو مجتمع ہو کر بطور کورس کے گانے کی لے میں پڑھیں اسلیئے بچوں کی سمجھ کے نہایت سیدھے سادے الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں ۱۲

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

ہے دلّی کے فخر کا یہ دن
شہر میں آیا شہر کا محسن
وصف تمھارا گو نہیں ممکن
رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

آپنے ہم پر بھیجے ہیں افسر
کیسے کیسے رعیّت پرور
جن سے ہے ہندستان منوّر
فخر ہے انگلستان کو جن پر
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

آرکلاک احسان کا پتلا
آدمی کی صورت میں فرشتہ
تھا دلّی پر فضل خدا کا
تم نے جو دلی میں اُسے بھیجا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہیگا

آب وہوا سے شہر کی ساری
آئی تھی خلقت جان سے عاری
تم نے لگا کر نل اک باری
چشمہ حیواں کر دیا جاری
جب تک شہر آباد رہے گا

نام تمہارا یاد رہیگا

یوں تو ہیں سب احسان مسلّم سب سے ہے یہ احسان مقدم
تھے تعلیم میں کم سب سے ہم تم نے مدد کی اپنی پیہم
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

جوبلی کے جو خاص وظیفے پانچ برس کو ہمکو ملے تھے
لطف سے میعاد اُنکی بڑھا کے جیت لیئے دل آپ نے ہمسے
جبتک ملک آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا
مانگے تانگے پر تھا گذارا مٹ گیا اب خلجان یہ سارا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

درس کے گر سے جنہیں ہیں اکثر — قدرِ ضرورت سے کچھ بڑھ کر
بورڈروں کے رہنے کو ہیں گھر — کھیلنے کو میدان ہے سراسر

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

شہر میں جا کالج کو عطا کی — کیں اصلاحیں آب و ہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی — شرطِ حکومت تمنے ادا کی

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

تم میں ہیں جو موجود فضائل — وہ نہیں کچھ محتاج دلائل
لوگ سب انکے دل سے ہیں قائل — او! سرلائل۔ او! سرلائل

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمہارا یاد رہیگا

اشعار مدحیہ

بحضور سرڈینس افزیٹرک لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب۔ انبالہ کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے

قیصر ہند کے ہیں کڑوں احسان جہاں — اسکا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احساں
حکمراں آئے ہیں پنجاب میں ابتک جتنے — ایک سے ایک کا پلہ ہے عدالت میں گراں

جبکہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا اسدم　　وقتِ رخصت تھا ہر اک آنکھ بہ حسرت نگراں
حال جو ہوتا ہے بچوں کا بچھڑ کر ماں سے　　یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں
جانشیں اُنکے ہوئے آنکے جب سر لائل　　عہدِ سابق کو گئے بھول سب ابنائے زماں
شکر سے عہدہ بر آ اُسکے نہیں ہو سکتے　　رحم و انصاف ہوا ذات سے جو اُنکی عیاں
اُٹھ گیا سر سے جب اس مُلک کے سایہ اُن کا　　ہاتھ میں آپ نے لی آکے حکومت کی عناں
کار فرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ　　معدلت آپ کی اُسوقت سے مشہور ہے یہاں
حیدر آباد میں۔ میسور میں۔ کلکتہ میں　　نیکنامی کے کیئے کام۔ رہے آپ جہاں
ہے یہ اب آپ سے اُمید کہ پنجاب میں بھی　　مشکلیں آپ سے سب مُلک کی ہونگی آساں
بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈنیس بھی　　چھوڑ جائینگے ہر اک دل پہ عقیدت کے نشاں

انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل رُبا ہیں جن پر کہ تُو ہے شیدا　　جب دور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا
وہ عالمِ جوانی جسپر کہ تو ہے مفتوں　　جائے گا ٹوٹ جس دم اُس کا طلسم سارا
جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تُونے اُسکو　　تھا جو کہ تجھکو اپنا آرام دل سمجھتا
چل دینگے جب وہ سارے اُن بلبلوں کی مانند　　بعد از بہار جو رُخ کرتیں نہیں چمن کا
جب ہو چکے گا آخر عیش کا زمانہ　　کون آکے دے گا تجھکو اُسکے سوا سہارا
بے مہریوں سے تو نے جسکو کیا ہے غمگیں　　تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آکے لے گا

جسطرح وہ پرندہ جو فصلِ گل میں جاکر / پھر موسمِ خزاں میں آکر ہے ہم سے ملتا

دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا / سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا

تو ہے سرمایۂ عزت یا میں / تو ہے انسان کی دولت یا میں

ہے زمانہ میں بڑی بات تری / دیکھیں ہم بھی کرامات تری

وقت سے ہنسکے یہ دولت نے کہا / تجھکو اے وقت نہیں عقل ذرا

ہے عجب۔ جس کو خدائی مانے / اُسکی تو خوبیوں میں شک جانے

سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے / لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے

نام اقبال ہے آنے کا مرے / لقب ادبار ہے جانے کا مرے

مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما / علم بھی ایک طفیلی ہے مرا

لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال / لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں۔ مگر / میں نہ ہوں۔ تو نہیں کچھ قدرِ بشر

چند روز آگئی میں جس کے کام / زندہ تا حشر رہا اُس کا نام

جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا / وہ سدا خوار و نگونسار رہا

ہو نہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں / اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

چاہتے ہیں مجھے سب خُرد و کلاں / پھرتے ہیں دُھن میں مری پیر و جواں

گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو — کسی آغاز کا انجام نہ ہو

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا — درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رکھائی سے مری سب لرزاں — میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں — ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے مری وہ شانِ عظیم — کرتے آتے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھکو — میری عظمت نہیں باور تجھکو

تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا — جسنے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سُن کے کہا اے دولت — شک نہیں اسمیں ذرا اے دولت

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر — اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھکو خبر

تو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی — اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی

کیجئے فرض تجھے گر چشمہ — تو ہوں اُس چشمہ کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تو ہے اہلِ مکاں؟ — پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں

تو جو کھیتی ہے تو مینہ میں ہوں — تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے قرابہ ترا اگر عطر آگیں — میں ہوں اُس عطر کی وہ اللہ زمیں

ہے عبث تجھکو تفوق کا خیال — تو ہے گر مال تو میں راس المال

جنکے قبضے میں ہوں اے دولت — تجھپہ رکھتے ہیں وہ دست قدرت

لاکھ بار اُنسے اگر بھاگے تو — بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو

اُنکی مٹھی میں ہے تو اے دولت | طائرِ رشتہ بپا کی صورت
نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود | جس کا نایاب ہی عالم میں وجود
کھوکے مجھکو کوئی پاتا نہیں پھر | جاکے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر
ایک پل میری اگر دیجے گنوا | لیجے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اُٹھا
تو اگر اپنی لُٹا دے ثروت | پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت
ہیں اسیواسطے جو اہلِ تمیز | میری ایک ایک پل اُنکو ہے عزیز
میرے جو لوگ کہ ہیں قدرشناس | ہے مرا جاگتے سوتے انھیں پاس
جانتے ہیں حکما و عُرفا | مجھکو سرمایۂ دین و دنیا
دل ہیں جن کے مری کچھ قدر نہیں | اُن کی قسمت میں نہ دنیا ہی نہ دیں
نہ کوئی کام ہوا اُن سے انجام | نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ اُنھیں دین کی دولت ہاتھ آئے | اور نہ دنیا کبھی اُن سے پتیائے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ | نہ ہو قدرت ہیں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
نہ مدد اُنسے کچھ اپنی کی جائے | نہ خبر اُنسے کسی کی لی جائے
گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت | ہے مگر تنگ مجال فرصت
بس زیادہ نہیں مُہلت مجھ کو | بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اسمیں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری ایک اک آن

ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جنہیں کچھ قدرِ قلیل
اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل

اُن کو ایسوں سے نہیں ملنا روا
جو لیاقت رکھتے ہیں اُن سے سوا

اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں
دیکھنا لازم پہاڑ اسکو نہیں

سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر
شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر

چاہیئے دن کو نہ نکلے زینہار
ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرمسار

قطعات تاریخ اور تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

راقم کو فی الواقع مادّہ تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے۔ اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقّت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسن اتفاق سے بغیر اسکے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادّہ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اسپر صرف مصرعے لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اسلئے اکثر طوعاً و کرہاً یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اُپج سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔

ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیئے آیا کرتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کر کے اُسکے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ تو یہ قفل بغیر کنجی کے کھولدے۔ اُسنے کہا بھائی میں نے نبوت کا دعوے کیا ہے۔ آہنگری کا دعوےٰ نہیں کیا۔ اُنکا مطلب اِس نقل سے یہ تھا کہ ہمنے خدا کی طلب میں درویشی اختیار کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل اور سیانا بھی بننا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے ملک میں اُن لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اگ

تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی اُنسے اُسوقت متعلق ہوجاتی ہے جب کوئی مہتم بالشان واقعہ ظہور میں آتا ہے مثلاً کسی کے اصطبل کی مرمت ہوئی۔ یا گھوڑا اختہ کیا گیا۔ یا کسی کی مینا مرگئی۔ یا مرغ پالی جیتا۔ یا بلّی نے بچّے دیئے ایسے وقت میں شعراکو مقابلہ کے امتحان کا موقع ملجاتا ہے۔ جو شخص مادّہ تاریخ فی الواقع یا صاحب فرمایش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا ہے اُسکا فی الجملہ اعتبار بڑھجاتا ہے راقم چونکہ تاریخ نکالنے میں سدا سے ہیٹا تھا اسلیئے ہمیشہ اس امتحان سے کترا تا رہا لیکن بری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمایش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی تھیں اُنمیں سے جسقدر دستیاب ہم پہنچیں دیوان میں شامل کردی گئیں۔ تاکہ دیوان کے ضروری اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہوجائے۔

تاریخ وفات مرزا غالب مرحوم دہلوی

غالب نے جبکہ روضۂ رضواں کی راہ لی — ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اُسدن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ — دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا
حالی کہ جسکو دعویٔ تمکین و ضبط ہے — دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا
تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستاں نژاد — عرفی و انوری کا مگر ہمنبرد تھا

8 یہ تاریخ خود غالب مرحوم کی غزل کے ایک مصرعہ سے نکالی گئی ہے۔ انکی غزل کا مقطع یہ ہے۔ یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اخیر مصرع کے اعداد ۲۷۹۶ ہوتے ہیں۔ جب انمیں سے لفظ تاریخ کے عدد یعنی ۱۲۱۱ اور لفظ فکر کے عدد یعنی ۳۰۰ کا تخرجہ کیا گیا تو ۱۲۸۵ باقی رہے اور یہی انکا سال وفات ہے مختصر صورت تاریخ کی یہ ہوئی ۲۷۹۶ - (۱۲۱۱ + ۳۰۰) = ۱۲۸۵ھ

اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد — اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا
ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جانگزا — دل تھا کہ فکرِ سال میں بے صبر گرد تھا
ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا — (سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا)
"تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیرِ فکر — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

۱۲ ۳۰۰ ۶ ۹ ۷ ۲

تاریخ وفات محمد ابراہیم جوان مرگ طالب علم بی اے کلاس دہلی کالج

محمد براہیم چوں ترکِ جاں گفت — زنخلِ جوانی ثمر برنخوردہ
بگفتم زروئے الم سالِ فوتش — بجاں آفریں جان شیریں سپردہ

۱۲۹۲ + ۱ = ۱۲۹۳ ھ

تاریخ وفات سیّد خواجہ ناصر وزیر مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیر راہیِ ملکِ بقا — سب ہوئے اندوہگیں شہر کے برنا و پیر
دل نے کہا ہر جگہ پھبتی ہے چیز اک جدا — باغ میں نسرین و گل چرخ پہ مہر منیر
عیش میں شعر و غزل سوگ میں تاریخ مرگ — غیب سے آئی ندا "خلد میں ناصر وزیر"

۱۲ ۹۸ ھ

تاریخ طبع جغرافیہ بے مثال مؤلفہ خواجہ سیّد شہاب الدّین حسن صاحب دہلوی

وہ جغرافیہ جسکی تھی احتیاج — چھپا مژدہ اے طالبانِ کمال
نئی طرز کا ہے یہ جغرافیہ — عیاں جس سے ہے ربع مسکوں کا حال
ملی طرفہ تر اس کی تاریخ طبع — وہ خود طرفہ ہے جیسے قیل و قال
اگر سال ہجری کی ہے جستجو — تو جغرافیہ خود بتاتا ہے سال
(۹۹ ۱۲ھ)
ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی — کہو اسکو جغرافیہ بے مثال
(۱۸ ۶ ۸۲)

تاریخ بہ پایاں رسیدن بنائے سید مہربان علی مرحوم رئیس گلاؤٹھی در بلند شہر

علی آں سیدِ والا کہ باشد — بنامش مہرباں جزوے ز اجزا
بود با ذاتِ او توام سیادت — چناں کز نام او مہر ست پیدا
چو ایں کاشانہ را بنیاد بنہاد — بعہدِ حاکمِ بیدار و دانا
گروس آں فیض گستر کز وجودش — شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا
چنیں گفتمش حالی سالِ تعمیر — مکانِ بے نظیر آباد بادا
(۱۲ ھ ۹۹)

تاریخ اورنگ نشینی حضور آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی خاں بہادر فرماں روائے ملک دکن

بہ سالِ فرخ و ماہِ سعید و روزِ فرخندہ — نظام الملک محبوب علی خاں آصفِ ثانی

بہ تخت سلطنت بنشست و حالی گفت تاریخش — برایے وے مبارک تاج و اورنگ جہانبانی

تاریخ تالیف قواعد اردو مولفہ خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

قواعد ہے یہ اردو کی کہ جس کا — بیاں شافی ہے اور ترتیب محکم
کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی — زیادہ حجم میں اور نفع میں کم
مگر یہ مختصر ہے اک رسالہ — کہ ہیں جسمیں قواعد سب فراہم
وجود اسکا ہے گو سب سے مؤخر — پہ خوبی میں ہے اکثر سے مقدم
جو قیمت پوچھئے تو ہے بہت سہل — نہ دینار اسمیں لگتے ہیں نہ درہم
اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب — تو ہے اے طالبو "اکسیر اعظم"
۱۳۰۲ھ

تاریخ رحلت نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

درد اکہ ضیاء دین احمد بربست — رخت سفر از جہاں کہ جائے الم است
از طاق و ز ایوان و ز بزم و جلسا — بگسستہ بہ رحمت الٰہی پیوست

8 یہ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ ۹۲۹ میں سے جو کہ ضیاء دین احمد کے اعداد ہیں ۳۲۱ جو کہ طاق - ایوان - بزم اور جلسا کے اعداد کا مجموعہ ہے تخرجہ کرکے باقی یعنے ۶۰۸ کو ۶۹۴ میں جو کہ رحمت الٰہی کے اعداد ہیں ملانے سے ۱۳۰۲ حاصل ہوتے ہیں اور یہی نواب مرحوم کا سال وفات ہے مختصر صورت تاریخ کی یہ ہے ۹۲۹ (۱۱۰ + ۶۸ + ۴۹ + ۹۴) = ۶۰۸ + (۶۹۴) = ۱۳۰۲ھ

تاریخ طبع دیوان منشی اقبال حسین صاحب متخلص بہ عاشق

جواں مرد آزادہ عاشق کہ نیست — در اقرانِ خود کس مر او را قریں
نہ صیّاد و ہموارہ از حسنِ خلق — پئے صیدِ آزادگاں در کمیں
نہ سحّار و پیوستہ ز افسونِ نطق — کشد ز آشیاں باز و شیر از عریں
ہے بار وار جبہہ اش انبساط — اگر مہرباں ست و گر خشمگیں
نہ بینیش گہ سر کہ برابرواں — نہ یابیش افتادہ چیں بر جبیں
دو سال ست کافسونِ مہر و وفاش — ربودست صبرم ز جانِ حزیں
ولے دیر پیوند نا آشنا — کہ بودست فارغ ز مہر و ز کیں
ندانم کہ عاشق چہ افسوں دمید — کہ در باخت خود را بمہرش چنیں
سر رشتہ ہیہات دادم ز دست — سخن ز آسماں بود و رفت از زمیں
کنوں رانم از طبعِ دیوان سخن — کہ شد جلوہ فرما بہ نوعے گزیں
دریں روزہا کز صروفِ زماں — سخن شد مُہان و سخنور مَہیں
عروسِ سخن مے نیرزد بجو — بحسن ار بود غیرتِ حورِ عیں
صدا آباد بر عاشق و عزمِ او — کہ در دورِ ناسازگاری چنیں
ز معنی بہ بیگانہ و آشنا — فشاندست گنجینہ از آستیں

چو دیوانِ اردوے عاشق کہ ہست　　صنمخانۂ طرفہ گفتی زچیں

بہ پیرایۂ طبع آراستند　　شنیدند از ہر کنار آفریں

سخن کش نبود آز رشتے در جہاں　　زشادی نہ گنجید در پوستیں

چو حالی ہمے جست تاریخ طبع　　صنمخانۂ عاشق آمد سنیں

۷ ۰ ۱۳ ھ

تاریخ بنائے چاہ در محوطۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڈھ بحساب سال بعثتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بسعی جناب آنریبل سید احمد خان بہادر

بہ ہدایت کیجئے گر سالِ ہجرت کی محرم سے　　تو کیجئے سالِ بعثت کا مہِ شوال کو مبدا

کلام اللہ اترا آخرِ ماہ مبارک میں　　ہوا اس واسطے شوال مبدا سالِ بعثت کا

نکالے یہ مبارک سن جنابِ سید احمد نے　　بنایا اب جنھے دار العلم میں یہ چشمۂ زیبا

زروے سالِ بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش　　کہا ہاتف نے حالی سے کہ "چشمۂ فیض احمد کا"

۱۲ ب ۱۳ بعثی

تاریخ طبع ترجمۂ تاریخ دربار قیصری بحساب سال عیسوی

پنجاب کے ادارۂ تعلیمِ عام نے　　ایک اور کام ملک کے حق میں کیا ہے خوب

دربار قیصری کی جو تاریخ تھی چھپی　　اب ترجمہ اُسی کا مرتب ہوا ہے خوب

ہیں لفظ دلکشا تو مضامیں ہیں دلنشیں　　ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب

چھپکر ہوا تمام تو حالی نے یوں کہا
"دربار قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب"
۱۸ ۸۲ عیسوی

تاریخ بنائے مہماں سرا در موضع سون واقع پنجاب بحساب سال عیسوی

بحکم کرم آں وزیر جیپد کہ باقی است
نام بزرگان سون زنبال ونوالش
ساختہ منزلگہے چو بہر غریباں
تکیہ گہ ہر غریب آمادہ سالش
۷۷ ۱۸ ۶

تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

تاریخ وفات غفران مآب نواب محمد مصطفےٰ خان مرحوم دہلوی رئیس جہانگیر آباد متخلص بہ شیفتہ و حسرتی

جزاھم بما صبروا جنات وحریرا

ھ ۱ ۲

آیۂ قرآنی میں بما صبروا جنۃ وحریرا ہے چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی تھی اسلیے جنۃ کی جگہ جنات کردیا گیا ہے۔ جیساکہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجاے فروح وریحان وجنۃ نعیم کے ھنا روح وریحان وجنات النعیم کردیا ہے۔

چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد و آلام بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے۔ اسلیے اس آیت کا مضمون انکی وفات کے نہایت مناسب

تصور کیا گیا۔ یعنی جناب باری نے بعوض اُنکے صبر کے بہشت اور بہشت کا لباس اُنکو عنایت کیا

تاریخ وفات نواب محمد نقشبند خاں مرحوم ولد اوسط نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد

وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ

۹۴ ۱۲ ہجری

چونکہ عزیز موصوف ایک وجیہ و شکیل آدمی تھے اور اُنکی وفات عنفوانِ شباب میں واقع ہوئی تھی اسلیئے یہ آیت اُنکی تاریخ وفات کے لیئے نہایت مناسب اور موزوں سمجھی گئی۔ اللہ تعالےٰ اہل جنت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ "پنہائے گئے اُنکو چاندی کے کنگن" بجائے مضارع کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا اُنکی مغفرت ہو چکی اور اہل جنت کے تمام حقوق اُنکو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کی تاریخ وفات قرآن مجید سے برآمد ہوئی اور پھر ایک ہی سورت یعنی سورۂ دہر سے نکلی۔ اور دونوں آیتیں اہل جنت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بنائے آئینہ خانہ در ریاستگاہ بہاول پور

كَاَنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ

۹۶ ۱۲ ہجری

قرآن مجید میں اصل آیت "اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ" ہے تاریخ میں بضرورت تکمیل اعداد اور نیز بمقتضائے مقام اِنَّهٗ کی جگہ کَاَنَّهٗ کر دیا گیا ہے مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پورے نہیں ہوتے تھے اسلئے قَوَارِیۡر میں الف لام بڑھا کر اَلقَوَارِیۡر کر دیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں جب سبا کی بادشاہزادی بلقیس اول ہی دفعہ وارد ہوئی تو اسکو شیش محل کے صحن پر جسمیں آئینے لگے ہوئے تھے یہ گمان ہوا کہ گویا پانی بھرا ہوا ہے اُسنے فوراً پائینچے چڑھا لیے۔ حضرت سلیمان ؑ نے کہا " اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ " یعنی یہ تو ایک محل ہے جسمیں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ تاریخ بنا میں اِنَّهٗ کی جگہ کَاَنَّهٗ کر دینے سے یہ معنی ہوگئے کہ گویا یہ وہی سلیمان ؑ کا شیش محل ہے۔

یہ تاریخ ایک دوست کی فرمایش سے جو اُسوقت بہاول پور میں ملازم تھے بھیجی گئی تھی مگر ایسا سنا گیا تھا کہ پسند نہیں آئی۔ نہ اسلیئے کہ اسمیں دو جگہ اپنی طرف سے تصرف کیا گیا ہے بلکہ اسلیئے کہ نواب صاحب کا نام اسمیں نہیں تھا۔

تاریخ ولادت فرزند در حرم سر کار نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سر کار عالی

حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنۡ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِیۡمٌ

ھ ۸ ۳ ۱

اس آیت سے سنین مطلوبہ یعنی ۱۳۰۸ھ اسطرح نکلتے ہیں کہ آیت کے جملہ اُولےٰ یعنی "حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا" کے اعداد ۱۶۵۴ ہیں۔ انہیں سے هٰذَا کا تخرجہ اور ملک کریم کا بجائے اسکے

تعمیہ کرنے سے ۱۳۰۸ حاصل ہوجاتے ہیں۔

تخرجہ وتعمیہ کا اشارہ گویا " اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ " سے نکلتا ہے کیونکہ اس جملے کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے کہ نہیں ہے "ھذا" مگر "مَلَكٌ كَرِيْمٌ" تو اس سے یہ مطلب مستفاد ہوگا کہ اوپر کے جملے میں ھذا کی جگہ مَلَكٌ كَرِيْمٌ رکھدو۔ اور اسطرح ۱۳۰۸ حاصل ہوجائینگے

اصل آیت میں حاشَ للّٰہ ہے بضرورت لام ضعیفہ کرکے حاشَ کردیا گیا ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے (حاشا اللہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو ہونہو کوئی معزز فرشتہ ہی) جو عورتیں زلیخا کی فریفتگی پر اُسکو ملامت کرتی تھیں جب حضرت یوسف دفعتہً اُنکے سامنے آئے تو اُسوقت جو الفاظ اُنکے مونہ سے نکلے تھے اُنکو قرآن میں اسطرح نقل کیا گیا ہے۔

تاریخ وفاتِ مہین برادرِ راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر

سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

۱۳ ھ ۳

یہ تاریخ برادر زادہ راقم حافظ اخلاق حسین سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے والد مرحوم کی وفات سے چند روز بعد عین تلاوت کے وقت قرآن مجید سے اقتباس کی تھی جس سے بے کم وکاست سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مادۂ ندرت سے خالی نہ تھا اسلیئے بوجہ اتحاد کے اپنی تاریخوں کے ساتھ اس تاریخ کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ یہ تاریخ برادر مرحوم کے سنگِ قبر پر جوکہ دلّی میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے جوار میں واقع ہے کندہ ہے۔

قطعاتِ تاریخ از نتائج طبع جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر

چونکہ برادر مرحوم کی بہت سی تاریخوں میں سے چند قطعے باقی رہ گئے تھے اور انکی اشاعت کیلئے کوئی اور موقع نہ تھا اسلیئے بطور یادگار کے انکو بھی اپنے دیوان میں شامل کر لیا گیا ہے۔

تاریخ وفات جناب مولٰنا قلندر علی زُبیری پانی پتی غفر اللہ لہ متخلص عالمؔ

آن قلندر علی وحیدِ زماں — در نجابت زُبیری و سندی
خاکِ پانی پت از سکونت او — در جہاں شد عَلَم بہ مُستندی
مُرد و باخویش بُرد حکمت و علم — ماند خلقے بہ کوے نابلدی
جُز دلِ او کہ بود جملہ صفا — نقد ہر کیسہ جیدست و ردی
جُز کتابش[8] کہ با ہمہ حسنات — درج ہر نامہ نیکی ست و بدی
گفت سالِ وفاتِ او مظہرؔ — رفت عالمؔ بہ جنتِ ابدی

ھ ۱۲ ۹۳

تاریخ وفاتِ حافظ سعد اکبر مرحوم بانی مدرسہ اسلامیہ پانی پت

[8] کتاب سے مراد نامۂ اعمال ہے ۱۲ — [عالم] مولوی قلندر علی مرحوم عالم تخلص کرتے تھے ۲

چو سعدِ اکبر آں یارِ گرقوم | کہ مر اہلِ وطن را بود یاور
سوئے جنت زدنیا رخت بربست | ازیں غم تافت ولہا ہمچو آذر
دریغ آں نیک خواہِ جملہ احباب | دریغ آں غمگسارِ ہر برادر
دریغ آں درسگاہِ اہلِ اسلام | کہ ماند از مُردنش بے برگ و بے بر
چنیں سالِ وفاتش یافت مظہر | شدہ جنت مقامِ سعدِ اکبر

ھ ۱۳ ب

تاریخ اورنگ نشینی حضور نواب آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علیخاں بہادر دام اقبالہ فرمانروائے دکن

شاہِ دکن چوں نہاد حسبِ مرادِ عباد | افسرِ دولت بہ فرق پاے بر اورنگ داد
سالِ جلوسش خرد گفت کہ بے شد شدہ | فتنہ و فسق و فجور شرّ و فریب و فساد

ھ ا ۳ ب ا

ایضاً

عیاں شد چو عیدِ جلوسِ نظام | بسے خوشتر از عید و وصلِ حبیب
خرد فرقِ اعدا تراشیدہ گفت | کہ "نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب"

ھ ۱۳ ب ا

تاریخِ ولادت فرزندِ ارجمند در کاشانۂ اقبالِ حضور نظام دام اقبالہ

شد چو خورشیدِ شرف طالع بمشکوے نظام | قدسیاں گفتند شمعِ ملک و دولت آمدہ

مظہر اندر فکر تاریخ ولادت رفتہ بود — عقل گفت "ایں لعل از کان شرافت آمد"

۱۳۰۱ ہجری

تاریخ مدار المہامی نواب میر لایق علی خان مرحوم در سرکار عالی

دوش کردم ز عقل چند سوال — کوست حلال مشکلات و عقد
گفتمش کے بود کہ شاہ دکن — بنشیند بہ مسند اب و جد
گفت جشن جلوس فرخ او — در ہزار ست و سیصد ست و احد
گفتمش پس کہ باشدش دیواں؟ — قرعہ بر لایق علی خاں زد
گفتمش سنگہا درین راہ است — گفت زودا کہ حق بہ خواجہ رسد
گفتمش خواجہ کے شود دیواں؟ — گفت "حق می رسد بمرکز خود"

۱۳۰۱ھ

تاریخ بنا و مرمت مسجد مولانا حاجی ابراہیم حسین صاحب انصاری اثنا عشری پانی پتی دام ظلہ

جعفری[8] مذہبے بنا فرمود — بیت حق را کہ اعظم ست و قدیم
خبرش داد ملہم صادق — کرد تعمیر کعبہ ابراہیم

۱۳۰۱ھ

8 بانی مسجد یعنی مولانا ابراہیم حسین صاحب کے والد کا نام اعظم علی اور ان کے چچا کا نام جعفر علی اور دادا کا نام صادق علی یہ تینوں نام اور خود بانی کا نام قطعۂ تاریخ میں نہایت خوبی سے آیا ہے ۱۲

تمت

اشتہار

دیوان حالی مع مقدمہ متضمن ماہیت شعر و شاعری

دیوان اردو مشتمل بر قطعات و غزلیات و ترکیب بندات و رباعیات وغیرہ اور اوسکے اول مین ایک مبسوط مقدمہ جسمین شاعری کی حقیقت اور اوسکے حسن و قبح پر مفصل بحث کی گئی ہے از تصانیف جناب مولانا مولوی الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مقیم مدرسۃ العلوم علی گڈھ ابھی چھپکر تیار ہوا ہے اور تین قسم کے کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔

قیمت فی جلد علاوہ محصول ڈاک

۱- کاغذ ولایتی - لوح مینا کاری بر کاغذ چرمی .... صہ

۲- کاغذ ولایتی - لوح سادہ بر کاغذ آبی .... ے

۳- کاغذ سی رام پوری - لوح سادہ بر کاغذ آبی .... عاہ

جن صاحبون کو خریدنا ہو راقم کے پاس درخواست ارسال فرمائین - فوراً ویلیو پی ایبل پارسل کے ذریعے سے روانہ کیا جائیگا +

راقم

دہلی حویلی میر افضل مرحوم متصل کوچہ پنڈت

4/968.